معارف

مارچ ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰؍روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری؍منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۵ ماہ رجب المرجب ۱۴۴۱ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۲۰ء عدد ۳

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

ڈھائی مہینہ کا طویل عرصہ گزر گیا جب وسط دسمبر میں شہریت ترمیمی بل کے خلاف علی گڈھ اور جامعہ میں مظاہرے شروع ہوئے۔ ان کو دبانے کے لیے جس طرح بے مہار تشدد کا استعمال کیا گیا اس کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے یہ پورے ملک میں پھیل گئے۔ اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ یہ ابھی جاری ہیں بلکہ عام توقعات کے برخلاف ان کی شدت اور وسعت میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس قانون کی منصوبہ بندی کرنے والوں کو جس طرح اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اس میں مسلمانوں کے علاوہ سماج کے دوسرے طبقات بھی شامل ہوسکتے ہیں اسی طرح ان کو اس کا بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ ڈھائی مہینہ کا عرصہ ایک خاصا طویل عرصہ ہے، خاص طور سے موسم کی غیر معمولی شدت کے پیش نظر۔ ایک ایسی تحریک جس کی کوئی مرکزی قیادت نہ ہو، حکومت کے شدید دباؤ کے باوجود اس کا اتنی طویل مدت تک اپنی جگہ پر قائم اور باقی رہنا بجائے خود ایک غیر معمولی بات ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ تحریک اپنی جگہ پر قائم ہی نہیں ہے بلکہ مسلسل آگے بڑھ رہی ہے اور اس کے دائرۂ عمل میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ ملک کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا بالکل منفرد واقعہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے یہ بات سمجھ لی ہے کہ یہ ملک کے دستور اور آئین کی سالمیت کا مسئلہ ہے اور اگر اس کی حفاظت نہ کی گئی تو ہندوستانی سماج کی تصویر ہی یکسر بدل جائے گی اور مستقبل کا سماج دستور کی عطا کردہ عدل، مساوات اور آزادی کی اساس کے بجائے منوسمرتی کے تجویز کردہ قوانین پر قائم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے اطراف واکناف میں رہنے والے لوگ اپنے اور اپنی آئندہ نسلوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے جذبے سے سرشار جوق در جوق اس تحریک کا حصہ بنتے چلے جارہے ہیں اور حالات کا دباؤ ان کے عزم وحوصلہ کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہورہا ہے۔ اس تحریک کا سب سے نمایاں اور انقلاب آفریں عنصر اس میں بڑے پیمانے پر خواتین کی حصہ داری ہے جس طرح خواتین اس تحریک میں حصہ لے رہی ہیں اور اتنی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی اور اس سے وابستہ بے شمار مسائل اور مشکلات کے باوجود ان کا عزم وحوصلہ اسی طرح غیر متزلزل اور ناقابل شکست ہے جیسا کہ پہلے دن تھا۔ اس کی حیثیت دراصل ایک تاریخ ساز واقعہ کی ہے۔

اس تحریک کو ناکام بنانے کی کوششیں شروع سے ہی کی جاتی رہی ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ لیکن اب یہ تحریک ایک نہایت نازک مرحلہ میں داخل ہوچکی ہے اور غیر معمولی ضبط واحتیاط کی متقاضی ہے۔ علی گڈھ میں خواتین کا دھرنا ختم کرنے کے لیے جو کچھ کیا گیا وہ کیا کم تھا لیکن گزشتہ چند دنوں میں شمال مشرقی دہلی میں جو کچھ ہوا اس کا تصور بھی محال ہے۔ ٹھیک اس وقت جب ملک کے دارالسلطنت میں دنیا کی سب سے طاقتور مملکت کے صدر کی ضیافت کا اہتمام کیا جارہا تھا، ان کی قیام گاہ سے تھوڑی ہی دور مسلمانوں کے

سر سے قیامت صغریٰ گزر رہی تھی لیکن اس سیل بلا کو روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ پولیس وہاں موجود تھی لیکن ۲۶ر فروری کے انڈین ایکسپریس کے بقول "Delhi Police watches, looks other way" ان چند الفاظ میں اس المیہ کی پوری تفصیل بیان کردی گئی ہے۔ کئی دن پہلے سے تشدد کی کھلے عام دھمکی دی جارہی تھی لیکن کوئی احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کی گئیں اور نہ ان کو روکنے کی کوشش کی گئی جو فساد پر آمادہ تھے۔ کرفیو اس وقت نافذ کیا گیا جب سب کچھ ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے سروں سے جوئے خون گزر چکی تھی اور بے شمار گھروں کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ سپریم کورٹ اور دہلی ہائی کورٹ کے معزز جج صاحبان نے اس سلسلہ میں جس طرح فکر مندی اور دکھ کا اظہار کیا اس سے وہاں پائی جانے والی صورت حال بہت حد تک واضح ہوجاتی ہے۔ دہلی ہائی کورٹ کے معزز جج کے اس ریمارک سے کہ وہ دہلی میں ۱۹۸۴ء کو دہرانے کی اجازت نہیں دے سکتے، معاملہ کی غیر معمولی سنگینی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اخبارات اور تجزیہ نگار اس کا موازنہ ۱۹۸۴ء کے دہلی فسادات اور ۲۰۰۲ء کے گجرات فسادات سے کر رہے ہیں۔ جو تفصیلات سامنے آرہی ہیں وہ حد درجہ دردناک اور لرزہ خیز ہیں۔ ان سطور کے لکھنے تک اخبارات کے مطابق ۴۲ر اموات کی تصدیق ہوچکی تھی اور اس تعداد میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ یہ بہت دکھ کی بات ہے کہ دہلی حکومت ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے قاصر رہی جو اس سلسلہ میں اس کے اوپر عائد ہوتی ہیں۔ وزیر اعلیٰ نے اپنی حلف برداری کی تقریب میں دہلی والوں سے کہا تھا کہ آپ کا بیٹا وزیر اعلیٰ ہوگیا ہے، اب آپ کوئی فکر نہ کریں۔ لیکن شمال مشرقی دہلی کے باشندے اپنے بیٹے کا انتظار ہی کرتے رہے۔ یہ صحیح ہے کہ پولیس دہلی حکومت کے کنٹرول میں نہیں ہے اس کے باوجود بہت کچھ کیا جاسکتا تھا۔ اس میں شبہہ نہیں دہلی حکومت نے گزشتہ پانچ سال میں اپنے شہریوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے لیکن اگر جان و مال کی حفاظت کی بنیادی ذمہ داری پوری نہ کی جاسکے تو ان سب کا کیا حاصل۔

شروع ہی سے ان مظاہروں کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی گئی لیکن اس میں سماج کے مختلف طبقات کی بڑی تعداد میں شرکت کی وجہ سے یہ کامیاب نہیں ہوئی۔ یہ اس کا سب سے بڑا امتیاز بھی ہے اور اس کی سب سے بڑی قوت بھی۔ مہاتما گاندھی کے بعد یہ پہلی ملک گیر تحریک ہے جس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب شریک ہیں۔ قومی یکجہتی کا ایسا دلآویز منظر بڑی مدت کے بعد نظر آیا ہے اور اسے ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس کی ہر قیمت پر حفاظت بھی کی جانی چاہیے اور اس کی توسیع کے لیے ہر ممکن کوشش بھی۔ دستور کی حفاظت کی ذمہ داری ملک کے تمام باشندوں کے اوپر یکساں طور پر عائد ہوتی ہے اور باہمی اتحاد و اشتراک کے ذریعہ ہی اس سے عہدہ برآ ہونا ممکن ہے۔

شہریت کے مسئلہ پر حکومت اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اسے اس سلسلہ میں اتنا اصرار ہے کہ وہ اس مسئلہ پر احتجاج کرنے والوں سے بات چیت کے لیے بھی سامنے نہیں آرہی ہے

جو اس کے اپنے شہری ہیں۔ ملک کے عام باشندوں کے لیے بالعموم اور اقلیتوں اور کمزور طبقات کے لیے بالخصوص اس قانون کے جو دور رس مضمرات ہیں اور جن کا اب بڑی حد تک ادراک عام ہو چکا ہے، اس کے پیش نظر اس تحریک میں جو لوگ شامل ہیں ان کے لیے بھی اپنے قدم پیچھے کھینچنا ممکن نہیں ہے۔ آثار یہی ہیں کہ یہ ایک طویل کشمکش ہے، چنانچہ اس کے لیے تیاری بھی اسی لحاظ سے کی جانی چاہیے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان مظاہروں اور دھرنوں کے نظم و نسق کی ذمہ داری اسی طرح مقامی طور پر سنبھالنی ہوگی جس طرح اب تک ہوتا آیا ہے۔ چوں کہ اس پورے منظر نامہ میں ملی قیادت کہیں موجود نہیں ہے اس لیے بھی متبادل صورت یہی ہے۔ البتہ وسیع تر تناظر میں اس خلا کو ان انجمنوں اور تنظیموں کو پر کرنا ہوگا جو خاص اسی مقصد سے بنائی گئی ہیں۔ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ اس تحریک کو مکمل طور پر پُر امن رکھا جائے۔ اس تحریک کا مقصد دستور کی حفاظت ہے اور اس سے وابستہ تمام سرگرمیاں قومی پرچم کے سائے میں انجام دی جا رہی ہیں اس لیے اسے ہر قیمت پر دستور اور ملکی قانون کے دائرہ ہی میں رہنا چاہیے۔ اس تحریک میں قانون شکنی کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یہ بات باعث اطمینان ہے کہ ملک کے اطراف و اکناف میں ہونے والے مظاہرے پوری طرح پر امن رہے ہیں اور جہاں کہیں تشدد کا کوئی عنصر ان میں شامل ہوا ہے اس کے لیے مظاہرین ذمہ دار نہیں رہے۔

بہار اسمبلی میں چند دن پہلے اتفاق رائے سے ایک قرارداد منظور کی گئی ہے۔ اس کی تجویز اپوزیشن کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے مطابق ریاست میں این-آر-سی کا نفاذ نہیں کیا جائے گا اور این-پی-آر ۲۰۱۰ء کے فارمیٹ کے مطابق کرایا جائے گا۔ اس وقت حکومت اور اپوزیشن اس مسئلہ پر جس طرح آمنے سامنے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے اس فیصلہ کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ بہار میں این-ڈی-اے کی حکومت ہے اور وہاں وزیر اعلیٰ نتیش کمار بی-جے-پی کے ساتھ مل کر حکومت کر رہے ہیں۔ اس طرح بہار این-ڈی-اے کے زیر حکومت پہلی ریاست ہے جہاں اس طرح کی قرارداد منظور ہوئی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس قرارداد کی منظوری اتفاق رائے سے ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے بی-جے-پی ممبران نے بھی اس کے حق میں ووٹ دیا۔ اس کے اسباب جو بھی ہوں اور اس کے پیچھے جو بھی سیاسی مصلحت یا مجبوری ہو اس کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اس فیصلہ کے مضمرات کا صحیح اندازہ تو وقت گزرنے کے ساتھ ہی ہوگا۔ بہر صورت یہ ایک نہایت اہم پیش رفت ہے اور اس کی روشنی میں آئندہ کوئی راستہ نکلنے کے امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ''مولانا سید سلیمان ندوی کا علمی اور فکری ورثہ'' کے موضوع پر ۱۷-۱۸ / مارچ کو ہونے والے سیمینار کو دوبارہ ملتوی کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ سے سیمینار کے شرکاء کو جو زحمت ہوگی اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

مقالات

فارسی شعرا میں اشتراک تخلص پر مناقشے

پروفیسر شریف حسین قاسمی

فارسی شعرا کے درمیان مختلف ادبی امور پر بحث ومباحثے ہوتے رہے ہیں۔فن شعر کی تعریف، اس کے محاسن ومعائب اور دیگر گوناگوں موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔ایسا ہی ایک مسئلہ تخلص کا نظر آتا ہے،خاص طور پر اشتراک تخلص کا مسئلہ سنجیدہ،حساس اور پیچیدہ تھا اور دلچسپ بھی۔

فارسی شعرا کے تذکروں پر نگاہ ڈالیے، ہزاروں شعرا کے نام اور ان کے بیشتر اجمالی احوال ان میں مرقوم اور محفوظ ہیں،متعدد شعرا ایسے بھی رہے ہیں جن کے حالات زندگی تک تذکرہ نویسوں کی دسترس نہیں ہوسکی، البتہ ان کے کلام کے جستہ جستہ نمونے صاحبان ذوق سے دستیاب ہوگئے اور وہی تذکروں میں نقل کردیے گئے لیکن یہ انتساب شک کے دائرے سے باہر نہیں،تذکرہ نگاروں نے ایسے گمنام شعرا کو ''ملالا ادری وملالا اعلم، پسران ملافراموش بن ملاعنقا عدم آبادی اند'' کے عنوان کے تحت درج کیا ہے۔مصحفی نے ایسے ہی شعرا کے بارے میں لکھا ہے:

> ''بہت سے شاعر ایسے بھی تھے جو موزونی طبع اور تفنن خاطر کی وجہ سے شعر کہتے تھے۔ایسے شعرا نے کوئی تخلص اختیار ہی نہیں کیا اور انہیں اپنے کمال شاعری کے اظہار کا خیال بھی نہیں آیا''۔(۱)

شعرا کی اس کثرت کی بنا پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں،حتی کہ معاصر شعرا میں بھی اشتراک تخلص کی مثالیں سامنے آتی رہی ہیں، اس کی بظاہر ایک وجہ یہ بھی رہی ہے کہ وسیع وعریض فارسی دنیا میں خود شعرا ایک دسرے کے احوال سے واقف رہے ہوں، یہ کوئی لازمی امر نہیں۔

دیکھنے میں آتا ہے کہ شعرا عام طور پر اپنی پسند کا تخلص اختیار کرتے تھے،کبھی یہ تخلص ان کے

دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

نام کا ایک جزو ہوتا تھا۔ بعض شعرا نے کسی خاص مناسبت سے تخلص انتخاب کیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے اساتذہ، احباب یا سرپرستوں نے ان کے تخلص تجویز کیے یا تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ شعرا نے خود ہی اوائل میں کوئی تخلص اختیار کیا اور پھر کسی وجہ سے بعد میں اسے تبدیل کرلیا، بعض نے اس تبدیلی کا معاوضہ بھی لیا۔ یہ بھی ہوا ہے کہ ایک شاعر نے آخر تک دو تخلص باقی رکھے۔ بہر حال شعرا اپنے تخلص کے تحفظ پر اصرار کرتے تھے اور اس کے لیے کوئی بھی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، حتیٰ کہ جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔

شعرا میں اشتراک تخلص نے خاصی پیچیدگیاں اور الجھنیں پیدا کردی ہیں، بعد والوں کے لیے کبھی کبھی ایک ہی تخلص کے شعرا کے کلام کو ایک دوسرے کے کلام سے ممتاز کرنا دشوار ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تذکروں میں ایک ہی کلام دو مختلف ہم تخلص شعرا سے منسوب کردیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ معروف شعرا سے غیر معروف شعرا کا کلام منسوب کردیا گیا ہے۔ عطار نیشاپوری مشہور صوفی اور شاعر ہیں، ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ عطار تخلص کے ایک دوسرے نسبتاً غیر معروف شاعر کا بعض کلام حتیٰ کہ مکمل مثنویاں بھی شیخ عطار نیشاپوری سے منسوب کردی گئیں اور اس وجہ سے خود عطار نیشاپوری کے کلام کی بازیابی میں خلل واقع ہوا، یہ حقیقت انیسویں صدی کے وسط میں جاکر آشکار ہوئی۔

اشتراک تخلص سے پیدا شدہ پیچیدگیوں اور اس کے عواقب کی مثالیں ملاحظہ کیجیے جو بڑی سبق آموز اور انسانی فطرت کی بوقلمونی کی غماز ہیں:

لطف علی بیگ آذر پہلے محروم تخلص کرتے تھے۔ حسین و جمیل ایسے کہ تمام شہر میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔ ایک روز احباب کی مجلس میں آئے جہاں میرزا محمد جعفر راہب اور آغا محمد عاشق بھی موجود تھے، عاشق نے محروم (یعنی لطف علی بیگ آذر) سے پوچھا: آپ کا تخلص کیا ہے؟ جواب دیا: محروم۔ لطف علی بیگ نے بھی آغا محمد سے سوال کیا اور آپ کا تخلص؟ انہوں نے جواب دیا: عاشق۔ اس کے بعد میرزا محمد جعفر سے دریافت کیا: آپ کیا تخلص کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: عاشق محروم، اہل مجلس اس شوخی سے بے اختیار ہنس دیے، البتہ محروم کو یہ شوخی پسند نہیں آئی، وہ بدحظ اور آشفتہ خاطر ہوگئے، گھر لوٹے، اپنا پہلا دیوان غصے میں چولھے کی نذر کیا، تخلص تبدیل کیا اور آذر رکھ لیا، مزید برآں ہر جگہ

تلاش کیا اور راہب کا دیوان بھی جلا ڈالا۔(۲)

تیموری شاہزادے بایسنقر سلطان نے کچھ زمانے تک شاہی تخلص کیا، جب اسے معلوم ہوا کہ امیر آق ملک (شاہی سبزواری) نے یہ تخلص پہلے ہی سے اختیار کیا اور مشرق و مغرب میں اسی تخلص سے معروف ہے تو اپنے لیے "شاہی" تخلص ترک کر دیا۔ حالاں کہ وہ خود بادشاہ تھا اور اس کے لیے یہ سزاوار تھا کہ وہ "شاہی" تخلص اختیار کرے لیکن بقول صاحب تذکرۃ الشعراء (ص ۴۸۴) قسام ازل نے جو کچھ لکھ دیا اس سے عدولی محال ہے، بعضوں کو ظاہری بادشاہت (صورت شکل) عطا کی جاتی ہے اور بعض کو معنوی فرمانروائی، جس کو جو کچھ عطا کر دیا اس پر اضافے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بھی بہت ہوا کہ ممدوحین اور سرپرستوں نے اپنے سے وابستہ شعرا کے تخلص تبدیل کر دیے اور یہ ضرورت مند شعرا اف بھی نہ کر سکے، خوشی خوشی قبول کر لیا، وہ تخلص پسند رہا ہو یا ناپسند۔

اکبر کے دور میں ایک شاعر تھے متخلص بہ محنتی، اکبر سے تعلق پیدا ہوا، بادشاہ نے انہیں چکلہ سرہند کا قاضی مقرر کر دیا اور عیشی تخلص عطا کیا اور کہا تمہیں محنت (تکلیف) سے نجات دی اور عیش بخش دیا۔(۳)

ملا غنی امینی اکبر بادشاہ کے عہد میں کافی عرصے سے گجرات میں طبقات اکبری کے مصنف خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہے، یہ پہلے خوفی تخلص کرتے تھے، خواجہ نظام الدین نے یہ تخلص موقوف کر دیا اور انہیں امینی تخلص بخشا۔(۴)

اکبر کے ملک الشعرا ابوالفیض پہلے فیضی تخلص کرتے تھے، آخر میں فیاضی تخلص اختیار کر لیا تھا۔(۵)

اکبر کے اسی ملک الشعرا کا ایک بار سرمدی اصفہانی سے تخلص کے بارے میں مناقشہ ہو گیا، سرمدی اصفہانی فیضی تخلص کرتے تھے، اکبر کے حضور میں فیضی سے تخلص کے بارے میں اختلاف ہوا، ظاہر ہے فیضی نے کہا ہوگا کہ اپنا تخلص تبدیل کرو، سرمدی ملک الشعرا سے اس بابت بحث نہیں کر سکتے تھے، وہ اس جھگڑے میں نہیں پڑے اور سرمدی تخلص اختیار کر لیا،(۶) سرمدی نے ظاہر ہے مصلحت کے تحت ایسا کیا۔

فارغی شیرازی اکبر کے دور کے معروف متولی اور علوم دان (Scientist) فتح اللہ شیرازی کے بھائی تھے، ہندوستان آئے اور نواب بیرم خانخاناں سے منسلک ہو گئے، خانخاناں نے ان کی بڑی عزت کی، سر پر بٹھایا اور کسی وقت ان سے کہا کہ فارغی تخلص ہے شیخ عبدالواحد کا اور مجھے ان کی خدمت

میں قرب حاصل ہے، ان سے محبت اور نزدیکی ربط وضبط ہے، آپ اپنا تخلص بدل لیجیے اور خالقی رکھ لیجیے، فارغی نے قبول کرلیا، تخلص کی یہ تبدیلی ظاہر ہے مصلحت وقت کی بنا پر ہوئی تھی، اس لیے جب وہ ہندوستان سے اپنے وطن لوٹے تو اپنے پہلے تخلص سے دست بردار نہیں ہوئے، (۷) یعنی انھوں نے تخلص کی تبدیلی کو پسند نہیں کیا۔

ایسے شعرا کی تعداد بھی کم نہیں جنھوں نے اپنے سرپرستوں اور ممدوحین کے نام یا خطاب کی مناسبت سے اپنا تخلص اختیار کیا، حکیم عماد غزنوی (م ۱۰۰۹/ ۱۶۰۰) عماد الدولہ دیلمی کے مداح تھے، لہٰذا اسی مناسبت سے عمادی تخلص اختیار کیا تھا۔ (۸)

مولانا زمان وفائی تخلص کرتے تھے، سلطان بدیع الزماں سے وابستہ ہوئے تو اپنا تخلص بدل دیا اور اپنے ممدوح کے نام کی مناسبت سے زمانی رکھ لیا، لیکن وجہ یہ بتائی کہ احمد جامی بھی وفائی تخلص کرتے تھے اور ایک عظیم شخصیت سے اشتراک تخلص سزاوار نہیں۔ (۹)

یہ خیال بھی رہا ہے کہ بزرگ اور مقدس ہستیوں سے اشتراک تخلص مبارک نہیں ہوتا، اس ضمن میں میرزا محمد بیرنگ کے بارے میں ان کے ایک معاصر نے لکھا ہے کہ یہ لاہور میں مقیم اور عبدالصمد خاں بہادر دلیر جنگ کے ملازم تھے، ان کے شاگرد میاں خیر اللہ فدا نے ان کی تاریخ وفات کہی جس کا مادہ تاریخ ہے: ''باقی باللہ شد بیرنگ در بزم بقا'' اس میں ایک عدد زیادہ ہے، لطف یہ ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ بھی بیرنگ تخلص کرتے تھے اور میرزا بیرنگ کی عدم شہرت کا سبب یہی رہا ہوگا کہ انھوں نے ایک بلند مرتبت قطب وقت کا تخلص اختیار کرلیا تھا۔ (۱۰)

تذکرہ نگاروں نے اپنے مآخذ سے واقعات کو من وعن نقل نہیں کیا ہے، ''جتنے منہ اتنی باتیں'' کے مصداق ایک ہی واقعہ مختلف تذکروں میں جزئی اختلاف سے نقل ہوا ہے، ہر تذکرہ نگار نے واقعہ کے خاکے میں اپنے ذوق وسلیقے کے مطابق رنگ بھرا ہے، اس کی مثال نرگسی اور ہلالی کے بارے میں تخلص سے متعلق ان کا یہ مکالمہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود شعرا کے درمیان بھی تخلص کے معاملے میں چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔

مولانا نرگسی معاصر ہیں بدر الدین ہلالی کے، ان کے درمیان مناظرے، بیت بازی اور ہزلیات کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا، ایک مجلس میں نرگسی نے ہلالی سے کہا: تمہارا تخلص نہایت غلامانہ واقع ہوا

ہے، ہلالی نے جواب دیا: یہ صحیح ہے اور آپ کا تخلص کنیزانہ ہے۔(۱۱)

یہی مختصر سا واقعہ تذکرۂ حسینی (ص ۳۵۱) میں یہ تفصیل دھار لیتا ہے:

''ایک بار نرگسی ایک مجلس میں شریک تھے، مولانا بدرالدین ہلالی وہاں آنکلے اور نرگسی سے کچھ آگے بیٹھ گئے، نرگسی نے کہا: میرا تخلص نرگسی ہے، نرگس کو آنکھ سے نسبت دیتے ہیں اور آنکھ جسم کے دیگر اعضا کی سرآمد ہے، پس آپ کو مجھ سے پیچھے بیٹھنا چاہیے، مولانا ہلالی نے جواب دیا، میرا تخلص ہلالی ہے اور ہلال کو ابرو سے نسبت دی جاتی ہے اور ابرو کی جگہ آنکھ کے اوپر ہوتی ہے، اس لیے مناسب ہے کہ آپ سے بالاتر مقام پر بیٹھوں، نرگسی نے کہا: ہلال غلاموں کا نام ہوتا ہے اور غلاموں کو چاہیے وہ فروتر بیٹھا کریں اور مزید برآں میرے تخلص میں لفظ ''نر'' (مرد) بھی ہے، ہلالی نے کہا: درست ہے اور ''گسی'' کے نیچے زیر بھی ہے، نرگسی نے اسی دن سے اپنا تخلص بدل دیا اور آہی اختیار کرلیا''۔

اب اسی واقعہ کو بندرابن داس خوشگو کے الفاظ میں کچھ فرق کے ساتھ ملاحظہ کیجیے:

''ہلالی کو نرگسی سے کد تھا، ایک روز مجلس میں آئے اور صدر مجلس کی طرف بیٹھ گئے، نرگسی ان سے بائیں طرف بیٹھے تھے، انہیں رشک آیا اور یہ شعر پڑھا:

ناکسی گیر از کسی بالا نشیند عیب نیست　　روی دریا پرخس ودامان دریا گوہر است

(کسر نفسی کی عادت ڈالو، کسی سے بھی جلوتر بیٹھنا عیب کی بات نہیں، دیکھ دریا کی سطح پر خس و خاشاک تیرتے رہتے ہیں اور گوہر دریا کی تہہ میں پائے جاتے ہیں۔)

ہلالی نے جواب دیا: مجھے تین وجوہات سے تم پر بالانشینی حاصل ہے، پہلی وجہ یہ ہے کہ تمہارا نام نرگسی ہے اور میرا ہلالی، نرگس زمین پر ہوتی ہے اور ہلال آسمان پر، دوسری وجہ یہ ہے کہ نرگس کو چشم سے تشبیہ دی جاتی ہے اور ہلال کو ابرو سے اور ابرو کا مقام آنکھ کے اوپر ہوتا ہے، تیسری وجہ یہ ہے کہ نرگس عورتوں کا نام ہوتا ہے اور ہلال مردوں کا اور مرد ہمیشہ عورت کے اوپر رہتا ہے۔(بالای زن است)(۱۲)

شعرا حتی صاحبان اقتدار وثروت، تخلص تبدیل کرنے کے لیے حکم یا درخواست کو ٹھکرا بھی دیتے تھے، چاہے اس میں ان کی اپنی جان ومال کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو۔

سلطان سپلکی ہندوستان آئے، سپلک قندھار میں ایک موضع کا نام ہے۔ ہندوستانی عوام اسے سپلکی کہتے تھے، پ پر زیر، سپلک چھپکلی کو کہتے ہیں، سلطان سپلکی اس پر بہت برا مانتے تھے کہ

کیا کروں، مجھے اس طرح ایک گندہ مردار جانور کہتے ہیں، سپلکی خان زماں سے ملے، یہ بھی سپلکی کی طرح ''سلطان'' تخلص کرتے تھے، سپلکی نے خان زماں کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور پڑھا۔ خان زماں نے ایک ہزار روپے اور خلعت انہیں انعام بھیجا اور درخواست گزار ہوا کہ یہ تخلص ''سلطان'' میرے لیے چھوڑ دیجیے، سپلکی نے انعام واپس کر دیا اور کہلا بھیجا: ''سلطان محمد میرا نام ہے جو والد نے رکھا تھا، اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں، مزید برآں میں آپ سے چند سال پہلے سے اس تخلص سے شعر کہتا ہوں اور بڑی شہرت پائی ہے''۔ خان زماں نے کہا: اگر یہ تخلص ترک نہیں کرو گے تو تمہیں ہاتھی کے پیروں تلے کچلوا دوں گا اور کچھ پیچھے ہٹ کر ہاتھی وہاں منگوالیا، سپلکی نے کہا: کیا کہنے ہیں اس سعادت کے، شہادت حاصل کرنے جا رہا ہوں، جب ڈرانے دھمکانے کی باتیں بہت ہو گئیں خان زماں کے استاد (آخوند) مولانا علاء الدین لاری نے مداخلت کی اور کہا: مولوی جامی کے دیوان سے جو مجلس میں موجود تھا، ایک غزل سے فال لی جائے، اگر وہ اس غزل میں صراحت سے کہتے ہیں کہ یہ تخلص سپلکی ہی کا رہنا چاہیے تو سپلکی کو چھوڑ دیا جائے ورنہ جو آپ کا ارادہ ہے اس پر عمل ہو، جامی کے دیوان سے فال نکالی گئی، یہ غزل برآمد ہوئی:

دل خطت را رقم صنع الٰہی دانست بر سرسادہ رخان حجت شاہی دانست

(دل نے تیرے چہرے پر خط سبز کو صانع ازل کی تحریر سمجھا اور سادہ رخ محبوبوں کے چہرے پر ان کے فرمانروا ہونے کی دلیل گردانا۔)

سلطان محمد سپلکی نے فی البدیہہ ایک غزل کہی جس کا مطلع ہے:

ہر کہ دل را صدف سر الٰہی دانست قیمت گوہر خود را بہ کماہی دانست

(جس نے بھی اپنے دل کو اسرار الٰہی کا گنجینہ سمجھا اس نے اپنے گوہر شخصیت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگالیا۔)

حالاں کہ جامی کے شعر میں کوئی واضح اشارہ تخلص کے بدلنے یا نہ بدلنے کی طرف نہیں ہے، پھر بھی خان زماں بہت خوش ہوا، تعریف کی اور مزید انعام و اکرام سے سلطان کو نوازا اور لوٹا دیا۔ (۱۳)

بعض شعرا نے اپنے کسی خاص ہنر کی مناسبت سے بھی اپنے تخلص اختیار کیے تھے، مولانا کمال الدین ضمیری اصفہانی پہلے باغبان تخلص کرتے تھے، یہ رمل میں ماہر تھے اور رمل عبارت ہے۔ (۱۴)

دفین، اسم وعدد وحکم مطلق وغیرہ (یعنی انسان کے ضمیر) سے شاعر کے اس ہنر کے پیش نظر شاہ طہماسپ کی جن سے یہ وابستہ تھے، فرمائش پر ضمیری تخلص اختیار کرلیا، ضمیری غیاث الدین منصور کے شاگرد تھے، ایک شخص نے ان سے کہا کہ حمدان میں ایک شاعر ہے متخلص بہ ضمیری، مولانا ضمیری نے جواب دیا، وہ اچھا نہیں کررہا کہ ضمیری تخلص اختیار کررکھا ہے، وجہ یہ ہے کہ اس کا جتنا اچھا کلام ہوگا اس کی میرے نام سے شہرت ہوگی اور میرا کلام اس سے منسوب کردیا جائے گا، ضمیری کی پرواز خیال ملاحظہ ہو: (۱۴)

چو می بینم کسی از کوئی او دلشاد می آید　　فریبی کاوّل از وی خوردہ بودم ، یاد می آید

(جب بھی کسی کو دیکھتا ہوں کہ اس کی گلی سے خوش وخرم آرہا ہے، مجھے وہ فریب یاد آجاتا ہے جو میں نے پہلی بار اس سے کھایا تھا۔)

ضمیری از تپید نہای دل آگاہ شد دشمن　　بہ مجلس کاشکی در پہلوی او جا نمی کردم (۱۵)

(ضمیری وہ دشمن (محبوب) میرے دل کی تڑپ سے واقف ہوگیا، کاش میں مجلس میں اس کے پہلو میں نہ بیٹھتا)

اسی نوعیت کا ایک واقعہ تقی الدین اوحدی مصنف عرفات العاشقین اور علی نقی کے درمیان بھی ہوا تھا، ہوا یہ کہ شیخ علی نقی کمرہ ای کی شاہ عباس کے اعتماد الدولہ خاتم بیگ کی مجلس میں انہی تقی الدین اوحدی سے ملاقات ہوئی، شیخ علی نقی نے کہا کہ ہم دونوں علی نقی اور تقی الدین میں اس قدر زیادہ یکسانیت اور ہم رنگی ہے کہ میرے اشعار آپ کے نام سے اور آپ کے اشعار میرے نام سے بہت پڑھے جاتے ہیں، اسم و مسمیٰ میں بھی ہم ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں، اسی طرح نقی اور تقی میں ذاتی مجانست بھی ہے، اگر فرق ہے بھی تو محض ایک نقطے کا ہے، تقی الدین اوحدی نے کہا: لیکن اسم و مسمیٰ میں وہ نقطۂ عالیہ ہماری طرف ہے، اگر آپ بھی اس نقطے تک خود کو پہنچا دیں تو یقینی طور پر آپ حد کمال تک پہنچ جائیں گے، چونکہ اس نقطے سے نقی، تقی بن جائے گا، علی نقی یہ نکتہ آفرینی سن کر اپنی جگہ سے اچھلے، تقی اوحدی کو گلے لگایا اور خوشامدانہ گفتگو کرنے لگے۔ (۱۶)

نامناسب تخلص پر بھی دوست واحباب اعتراض کرتے تھے، میر حسین کفری شہزادہ مراد اور عبدالرحیم خانخاناں سے وابستہ رہے، بعض بزرگوں نے انہیں خطوط لکھے کہ سیادت ونجابت کے باوجود

یہ عجیب بات ہے کہ آپ نے کفری تخلص اختیار کیا ہے، کفری نے جواب میں اس کی وجوہات بیان نہیں کیں (جو تذکرے میں مرقوم نہیں)، کہتے ہیں متنبہ ہوگئے تھے لیکن موت نے یہ مہلت نہ دی کہ اپنا تخلص تبدیل کرتے۔(۱۷)

خود شعرا بھی جب اپنے تخلص اور استعداد و صلاحیت میں مناسبت نہیں دیکھتے تھے تو اپنا تخلص خود ہی بدل لیتے تھے، لکنتی پہلے روانی تخلص کرتے تھے، تخلص کے موافق طبیعت رواں نہ تھی، اس لیے ایمانداری سے اپنا تخلص لکنتی رکھ لیا، ان کے یہ دو شعر بہر حال ان کی روانی طبیعت اور معنی آفرینی کے ترجمان ہیں:

آنان کہ وصف حسن تو تقریر می کنند   خواب ندیدہ را ہمہ تعبیر می کنند

(جو بھی تمہارے حسن کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں، وہ ایک ان دیکھے خواب کی تعبیر کرتے ہیں، بس مبالغہ ہوتا ہے۔)

درصورت بہارم ارم جلوہ می دہند   تا مصحف جمال تو تفسیر می کنند (۱۸)

(ارم کی بہار میں تمہارے (محبوب) حسن کے جلوے دکھائے جاتے ہیں اور اس طرح تمہارے جمال کی توصیف و توضیح کی جاتی ہے۔)

کچھ ایسا ہی مولانا سایلی کے ساتھ بھی ہوا، ان کا نام زین الدین سلطان تھا، تہران کے بزرگ زادوں میں سے تھے، صاحب تحفہ سامی (ص ۱۶۲) تعجب کرتے ہیں کہ یہ نا ملائم و نامناسب تخلص اس معقول اسم ولقب کے ساتھ جمع کیسے ہوگیا، اس تخلص سے شعر کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔

اورنگ زیب عالمگیر کے دور کے نعمت خاں عالی معروف شاعر اور طنز نگار ہیں، ان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، یہ پہلے حکیم تخلص کرتے تھے، بعض حضرات نے اعتراض شروع کردیا کہ حکیم، کلیم (چکیم؟) کی تصحیف ہے، انہوں نے اپنے استاد نواب دانشمند خاں شفیعا سے رجوع کیا اور ان کے اشارہ پر عالی تخلص اختیار کرلیا۔(۱۹)

اشتراک تخلص خود شعرا کو بھی پسند نہیں تھا، ایسی صورت حال سے بچا جاتا تھا، محمد حسین فغفور لاہیجانی ہندوستان سے اپنے وطن لوٹے، وہاں رسمی تخلص اختیار کیا، وہاں پہنچ کر انہیں پتا چلا کہ تبریز کے ایک شاعر کا تخلص بھی رسمی ہے، وہ جب دوبارہ ہندوستان آئے تو انہوں نے اپنا تخلص رسمی سے بدل کر

فغفور مقرر کرلیا۔(۲۰)

ایسا بھی بہت دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک استاد اپنے شاگردوں کا تخلص یا خود متعین کرتا یا شاگرد کی درخواست پر یہ کام انجام دیا جاتا تھا،خورشید بلگرامی پہلے فصاحت تخلص کرتے تھے،اپنا کچھ کلام انہوں نے غلام علی آزاد بلگرامی کو اصلاح کے لیے پیش کیا،آزاد نے انہیں لکھا کہ اپنا تخلص تبدیل کردیں اور خورشید رکھ لیں،شاگرد نے استاد کی تجویز قبول کرلی (نشترعشق،ص ۵۶۸) شاید استاد نے اپنے اس شاگرد کے کلام میں فصاحت کے فقدان کا احساس کرلیا۔

رام بخش مطیع کایستھ قنوج کے قانون گو تھے، یہ پہلے دردی تخلص کرتے تھے، پھر نیاز اختیار کرلیا لیکن شاید مطمئن نہیں ہوئے، اپنے استاد ارشاد مآب (فاخرمکین) کی خدمت میں یہ قطعہ پیش کیا اور تخلص عطا کرنے کی درخواست کی:

ای کہ از آفتاب عالمتاب رای والای توست روشن تر

گر بجشی تخلصی زکرم نامور می شوم من احقر

(حضور آپ کا فرمانا، آپ کی رائے سورج سے زیادہ روشن ہے، اگر آپ اس احقر کو کوئی تخلص عنایت فرمادیں تو نوازش و کرم ہوگا۔)

شاگرد کی اس درخواست پر ارشاد مآب نے یہ رباعی لکھی اور انہیں بھیج دی اور مطیع تخلص عطا کردیا:

آوردہ دلت صدق و صفا ما چو شفیع من بعد گذشتیم زطعن و تشنیع

از پس بہ اطاعت زنیاز آمدہ ای زیبد بہ تو گر خطاب بخشیم مطیع (۲۱)

(تم نہایت صدق وصفا سے درخواست گزار ہوئے، اس لیے ہم بھی تمہارے کیے پر کوئی اعتراض نہیں کرتے، یعنی پہلے ہی ہم سے تخلص کی درخواست کیوں نہیں کی تھی، تم بہت اطاعت و نیاز سے درخواست کررہے ہو، اس لیے ہم اگر تمہیں مطیع تخلص بخش دیں تو یہ سزاوار ہے، اچھا ہے۔)

موہن لعل انیس فارسی شعرا کے ایک تذکرے انیس الاحبا کے مصنف ہیں، دل پھینک انسان تھے، پہلے خستہ تخلص کرتے تھے، شتاب رائے نام کے لڑکے پر عاشق اور اس کے نتیجے میں بے تاب ہوگئے، اس لیے بیتاب تخلص اختیار کرلیا لیکن پھر انیس تخلص لکھا، ممکن ہے ان کی اپنے

معشوق سے بگڑ گئی ہو۔(۲۲)

اردو اور فارسی کے معروف شاعر اور نقشبندی صوفی میرزا مظہر جان جاناں بھی تخلص کے معاملے میں ایک بار مشکل میں گرفتار ہو گئے تھے، یہ مظہر تخلص کرتے تھے، ان کے ہم تخلص غلام علی، مظہر نے اس اشتراک تخلص پر ان سے گفتگو کی اور کہا کہ میں بوڑھا ہوں، مظہر تخلص میں نے ابتدا ہی میں اختیار کر لیا تھا، آپ ابھی جوان ہیں یہ تخلص میرے لیے چھوڑ دیجیے، میرزا جان جاناں نے جواب دیا: یہ تخلص مولانا جلال الدین رومی نے مجھے عطا کیا، میں ترک نہیں کر سکتا، طے یہ ہوا کہ مثنوی معنوی سے فال نکالی جائے، جو بھی راہنمائی وہاں سے حاصل ہو، اس پر عمل کیا جائے، چنانچہ غلام علی نے جو وہاں مکالمے کے دوران موجود رہے ہوں گے، فال دیکھنے کے لیے مثنوی کھولی، یہ شعر نکلا:

جانِ اول مظہر درگاہ شد جان جاناں خود مظہر اللہ شد

آخر کار دونوں نے مظہر تخلص برقرار رکھا، مظہر جان جاناں اساتذہ کا کلام اس طرح کیفیت سے پڑھتے تھے کہ سامعین پر خاص حالت طاری ہو جاتی تھی، اس لیے سامعین بہت ذوق وشوق سے حاضر خدمت ہوتے تھے۔(۲۳)

احمد یار خاں یکتا (م ۲۳ جمادی الاول ۱۱۴۷ھ) ولد اللہ یار خاں سے ایک بار محمد عاقل کشمیری ثم لاہوری معروف بہ محمد اشرف یکتا نے کہا کہ آپ اپنا تخلص مجھے عنایت کر دیں، احمد یار خاں یکتا نے جواب دیا، پہلے یکتا (اکیلا) تھا، اب دوتا (دو) ہو گئے، اس میں کیا حرج ہے، محمد اشرف یکتا اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے، مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کے لیے قرار یہ پایا کہ دونوں ایک ایک طرحی غزل کہیں، جس کی غزل بہتر ہوگی یکتا تخلص اسی کا ہوگا، احمد یار خاں یکتا نے طرحی غزل کہی، سخن فہم احباب کو دعوت دی، محمد اشرف یکتا کو بھی اسی مجلس میں بلایا اور اپنی غزل پڑھی جس کے دو شعر ہیں:

تا خطش طرح جہانگیری کاؤسی ریخت لشکر زنگ چو رومی بسر روسی ریخت

بہ امیدی کہ شود جلوہ گر آں سرو رواں خاک شد جبہ و در راہ قدم بوسی ریخت

محمد اشرف یکتا یہ غزل سن کر حیران ہو گئے اور لب کشائی نہیں کی، احمد یار خاں یکتا نے اسی مضمون کا ایک مختصر نامہ لکھا، اس پر صاحبان ذوق حاضرین کی مہریں لگوائیں، مجلس میں شاہ آفرین لاہوری بھی موجود تھے، انہوں نے اپنی مہر لگانے کے بجائے یہ بیت لکھا:

گواہیم آفرین بر ایں سخن ہا کہ احمد یار خاں یکتاست یکتا (۲۴)

(آفرین، ہم اس کے گواہ ہیں کہ سخنوری میں احمد یار خاں یکتا، یکتا ہے۔)

شعرا تخلص کی تبدیلی کے لیے حتیٰ اس کی قیمت بھی ادا کرتے تھے، نظیری نیشاپوری ہندوستان میں فارسی کے مشہور اور استاد شاعر گزرے ہیں، مشہد کے ایک شاعر بھی نظیری تخلص کرتے تھے، نظیری کی درخواست پر انھوں نے اپنا تخلص نظیر سے بدل لیا تھا، کہا جاتا ہے کہ نظیری نے حرف ''ی'' کو گرانے کے لیے مشہدی شاعر کو دو ہزار قیمت ادا کی، صاحب نشتر عشق کا خیال ہے کہ تخلص کی تبدیلی کا کاروبار خط و کتابت کے ذریعے انجام پایا ہوگا، چوں کہ نظیر، نظیری کے انتقال کے کافی عرصے بعد ہندوستان آئے۔ واللہ اعلم۔ (۲۵)

یہ بھی دلچسپ ہے کہ محمد افضل سرخوش نے بندرابن داس کو خوشگوار تخلص دیا اور کہا: میں نے اپنے تخلص (سرخوش) سے ایک لفظ ''خوش'' تمھیں بخش دیا۔ (۲۶)

میرزا کامران گویا اور میرزا داراب بیگ جویا دو کشمیری بھائی تھے، دونوں معروف شاعر تھے، گویا کشمیری کہا کرتے تھے کہ دیکھو! ہم دونوں بھائیوں نے کس طرح ابوطالب کلیم کا نام برادرانہ طور پر آپس میں تقسیم کر لیا ہے، (۲۷) (کلیم۔ گویا، طالب۔ جویا)

ایسے بھی شعرا تھے جو تخلص اختیار ہی نہیں کرتے تھے، میرزا محمد علی کے والد کرمان سے دہلی آئے اور میرزا یہیں پیدا ہوئے، دونوں باپ بیٹے شجاع الدولہ بہادر کے ملازم اور آغا اسماعیل کے رسالے میں خدمت انجام دیتے تھے، میرزا محمد علی نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا، ان کا شعر ہے: (حدیقہ ہندی، ص ۲۵۳)

خم ابروی تو مثل کمان است دلم قربان اوبردم از آن است

(محبوب تمہارے ابرو کمان کی طرح ہیں اسی لیے میں نے اپنا دل اس پر قربان کر دیا ہے۔)

شعرا دو تخلص بھی رکھتے تھے، بھورے سنگھ (رام سنگھ) مشرب اور مشربی دونوں تخلص کرتے تھے۔ (۲۸)

یہ ہے ایک مختصر روداد تخلص کے بارے میں شعرا کے درمیان اختلافات و مناقشوں کی جو ہر دور میں رونما ہوتے رہے اور جو عام طور پر شعرا کے درمیان مخاصمت، طنز و مزاح و اعتراض و تنقید پر منتج ہوئے۔

حواشی

(۱) عقد ثریا، ص ۲۸۶۔ (۲) ایضاً، ص ۱۳۵۔ (۳) ریاض الشعرا، ص ۱۴۴۱۔ (۴) حدیقہ ہندی، ص ۷۵۔ (۵) سرو آزاد، ص ۱۹۔ (۶) منتخب التواریخ، ص ۱۶۶، نشتر عشق، ص ۷۷۰۔ (۷) نشتر عشق، ص ۷۔ (۸) ایضاً، ص ۱۰۰۹۔ (۹) عرفات العاشقین، ص ۱۶۷۹۔ (۱۰) مردم دیدہ، ص ۱۵۱۔ (۱۱) عرفات العاشقین، ص ۴۳۳۷۔ (۱۲) سفینۂ خوشگو، دفتر دوم، ص ۷۸۹۔ (۱۳) منتخب التواریخ، ص ۱۶۴۔ (۱۴) عرفات العاشقین، ص ۲۴۰۹، نشتر عشق، ص ۶۷۴، ۹۳۳۔ (۱۵) ایضاً، ص ۱۳۶۱۔ (۱۶) ایضاً، ص ۷۷۴۴۔ (۱۷) طبقات شاہجہانی، طبقہ تاسعہ، ص ۸۵۔ (۱۸) نشتر عشق، ص ۱۳۸۶۔ (۱۹) ریاض العارفین، ص ۱۰۔ (۲۰) ایضاً، ص ۹۸، سرو آزاد، ص ۷۳۔ (۲۱) حدیقہ ہندی، ص ۲۳۲۔ (۲۲) سفینہ ہندی، ص ۱۷۔ (۲۳) ایضاً، ص ۱۸۷، حدیقہ ہندی، ص ۲۵۱۔ (۲۴) عرفات العاشقین، ص ۲۶۱، سرو آزاد، ص ۲۰۰۔ (۲۵) سرو آزاد، ص ۱۷۳۔ (۲۶) تذکرۂ شعراء پنجاب، ص ۱۷۳۔ (۲۷) نشتر عشق، ص ۱۳۷۴۔ (۲۸) گل رعنا، ص ۳۳۳۔

فہرست مراجع

عقد ثریا: شیخ غلام مصحفی، بہ تصحیح ڈاکٹر محمد کاظم کہد ولی، نیر د ایران، ۱۳۸۰ شمسی۔ ریاض الشعرا: علی قلی والہ داغستانی، بہ تصحیح پروفیسر شریف حسین قاسمی، رامپور رضا لائبریری، رامپور ۲۰۰۱ء۔ سرو آزاد: غلام علی آزاد بلگرامی، لاہور ۱۹۱۳ء۔ منتخب التواریخ: عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی، انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران، ایران، ۱۳۷۹ شمسی۔ نشتر عشق: حسین قلی خاں عظیم آبادی، بہ تصحیح اصغر جان فدا، نشریات دانش، دوشنبہ ۱۹۸۱ء۔ عرفات العاشقین وعرضات العارفین: تقی الدین محمد اوحدی، بہ تصحیح ذبیح اللہ صاحبکاری و آمنہ فخر احمد، میراث مکتوب، تہران، ۱۳۸۹ شمسی۔ مردم دیدہ: عبدالحکیم لاہوری، پنجابی اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۸ء۔ تذکرۂ حسینی: میر حسین دوست سنبھلی، نولکشور، لکھنؤ ۱۸۷۵۔ سفینۂ خوشگو، دفتر دوم: بندرابن داس خوشگو، بہ تصحیح ڈاکٹر کلیم اصغر، مجلس شورائی اسلامی، تہران، ۱۳۸۹ شمسی۔ طبقات شاہجہانی، طبقہ تاسعہ: محمد صادق کشمیری، بہ تصحیح ڈاکٹر محمد اسلم خاں، شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی ۱۹۹۳ء۔ ریاض العارفین: رضا قلی ہدایت، تہران، ۱۳۴۴ شمسی۔ حدیقہ ہندی: بھگوان داس ہندی، بہ تصحیح، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، نیشنل مشن فار مینسکرپٹس، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء۔ سفینہ ہندی: بھگوان داس ہندی، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، ۱۹۵۸ء۔ گل رعنا: لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (شامل تین تذکرے) بہ تصحیح نثار احمد فاروقی، مکتبہ برہان، دہلی ۱۹۶۸ء۔ تذکرۂ شعرای پنجاب: فرہنگ خواجہ عبدالرشید، اقبال اکیڈمی، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۱ء۔ تذکرۃ الشعرا: دولت شاہ سمرقندی، بہ تصحیح محمد عباسی، انتشارات کتاب فروشی بارانی، تہران، شاہ آباد ۱۳۳۷ شمسی۔

خانقاہ رائے پور کی دینی خدمات

پروفیسر محمد انس حسان

خانقاہ رائے پور کا تعارف: رائے پور یہ یوپی کے سہارنپور شہر سے شمال کی جانب تقریباً ۳۶ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک مشہور قصبہ ہے۔ اس کا شمالی حصہ کوہ شوالک کے دامن میں واقع ہونے کی وجہ سے ندی نالوں کی بہتات، سرسبز و شاداب اور دلفریب مناظر سے بھر پور ہے۔ راما چندرا کے بیٹے براہما دیو رائے نے اس قصبے کو ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۲ء میں آباد کیا تھا۔(۱) اس اعتبار سے اس قصبے کی تاریخ چھ سو سال سے زیادہ پرانی ہے۔ رائے پور میں خانقاہ کی بنیاد دراصل مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری (۱۸۵۳-۱۹۱۹ء) نے رکھی جو ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں اپنے مرشد میاں عبدالرحیم سہارنپوری (متوفی ۱۸۸۶ء) کے حکم پر رائے پور کے قریب گاؤں ''عالم پور'' میں واقع ''مادھو والا باغ'' میں خیمہ زن ہوئے۔ ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں ان کے شیخ کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء میں انہوں نے اپنے ننھیال رائے پور میں قیام فرمایا اور ایک مدرسہ تعلیم قرآن کا قائم کیا۔ بعد میں یہی مدرسہ ''گلزار رحیمی'' کے نام سے موسوم ہوا اور اسی مبارک مقام کو ''خانقاہِ رحیمیہ رائے پور'' کہلانے کا اعزاز حاصل ہوا۔

یہ خانقاہ بنیادی طور پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) کے سلسلے کے بزرگوں سے متعلق و متاثر رہی ہے۔ چنانچہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۸۱۷-۱۸۹۹ء)، مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۳-۱۸۸۰ء) اور مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۹-۱۹۰۵ء) نے اس خانقاہ کی ہمیشہ سرپرستی کی، شیخ الہند مولانا محمود حسن (۱۸۵۱-۱۹۲۰ء) نے جب انگریز سامراج کے خلاف تحریک آزادی کو ایک نئے دور میں داخل کیا تو اس خانقاہ کے مشائخ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا اور مخلوق خدا کی روحانی و اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کو غلامی کی دلدل سے نکالنے کی جدو جہد کی۔ اس خانقاہ نے اپنے دور کی روایتی

گورنمنٹ ڈگری کالج، جہانیاں، پاکستان۔

خانقاہوں کے برخلاف فکری، علمی اور عملی میدان میں نمایاں کردار ادا کیا۔(۲) خانقاہِ رائے پور کا عمومی مزاج دین کی جامعیت کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھنا ہے۔

خانقاہ رائے پور کی خصوصیت : خانقاہِ رائے پور کے مشائخ نے انسان دوستی اور تزکیہ نفس کے اجتماعی ثمرات پر بہت زور دیا ہے۔ چنانچہ اس خانقاہ کے عمومی مزاج میں طویل مجاہدے اور اذکار کی بجائے عملیت پسندی اور اعلیٰ انسانی اخلاق پیدا کرنے کا جذبہ ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس خانقاہ کی تعلیمات عام فہم اور انسانی فطرت سے قریب تر ہیں۔خانقاہ کی چار دیواری میں محصور ہونے اور سماج کے عصری تقاضوں سے لاتعلق و بے خبر رہنے کا مزاج اس خانقاہ کا کبھی نہیں رہا۔

یہ بات درست ہے کہ خانقاہِ رائے پور کی دینی جدوجہد اور تحریک آزادی میں کردار کا تذکرہ کم ملتا ہے۔اس سلسلہ میں مولانا عبیداللہ سندھی (۱۸۷۲۔۱۹۴۴ء) کی یہ تحریر اصل سبب کو بخوبی ظاہر کرتی ہے:

> ”عام طور پر لوگ تحریک آزادی میں رائے پور کی سیاسی اہمیت کو پوری طرح نہیں جانتے، میں اس سے بخوبی آگاہ ہوں۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ تحریکِ آزادی میں رائے پور نے جو کردار ادا کیا ہے، اس پر مضامین اور کتابیں لکھوں لیکن کیا کروں کہ حضرت اقدس رائے پوری (مولانا شاہ عبدالرحیمؒ) اس کو پسند نہیں کرتے تھے اور ہمیں اس کے بیان سے منع کیا ہوا تھا۔ایک وقت آئے گا کہ دنیا رائے پور کے سیاسی کردار سے اچھی طرح آگاہ ہوگی۔“ (۳)

خانقاہ رائے پور کے مشائخ : اس خانقاہ کے اب تک کے پانچ مشائخ کے اسماء درج ذیل ہیں:

۱۔مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری (۱۸۵۳۔۱۹۱۹ء) ۲۔مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری (۱۸۷۳۔۱۹۶۲ء) ۳۔مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوری (۱۹۰۵۔۱۹۹۲ء) ۴۔مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری (۱۹۲۶۔۲۰۱۲ء) ۵۔مولانا شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری (مسند نشین)۔

ذیل میں ان مشائخ کا ایک مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ: مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی ولادت ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۳ء میں ”تگری“ میں ہوئی۔ والد ماجد اشرف علی خاں کا تعلق حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے انتہائی

گہرا تھا۔ نام ''عبدالرحیم'' بھی حاجی امداداللہ مہاجر مکی نے ہی رکھا تھا۔(۴) آباواجداد کا اصل تعلق قصبہ ''گمتھلہ ''(۵) سے تھا۔ جدی جائیداد کی تقسیم کے سبب ان کے جدِامجد بابا طاہر شاہ(۶) موضع تگری تشریف لے آئے۔ والد محترم کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق سیدالطائفہ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بہت گہرا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ان کے والد ماجد کے مہمان بنے تھے۔(۷) حفظِ قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم اپنے وطن ''تگری'' ہی میں حاصل کیں۔ بعدازاں حاجی امداداللہ کے مشورے پر مدرسہ مظاہرالعلوم سہارن پور میں داخل ہوئے اور ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء میں درس نظامی کی تکمیل فرمائی۔ اساتذہ میں اکثر وہ حضرات ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔(۸) دورانِ تعلیم ہی ان کا تعلق میاں عبدالرحیم سہارنپوریؒ(۹) سے ہوگیا تھا جنھوں نے سلسلہ قادریہ نقشبندیہ مجدّدیہ میں بیعت فرمایا اور بعدازاں مجاز بھی کیا۔ ''تگری'' میں تھے اور اسی دوران ان کی شادی رائے پور کے ایک معزز خاندان میں ہوئی جن سے ایک صاحبزادے حافظ عبدالرشید (متوفی ۱۹۱۰ء) اور ایک صاحبزادی (وفات ۱۹۰۹ء) والدہ محترمہ شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ پیدا ہوئے۔ شیخ کے انتقال کے چار سال بعد حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کی صحبت بابرکت میں رہے۔ حاجی صاحبؒ نے اجازت وخلافت مرحمت فرمائی اور واپس جا کر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے رابطہ قائم کرنے کی تاکید فرمائی۔(۱۰) چنانچہ حضرت گنگوہیؒ کے پاس تشریف لائے، انھوں نے بیعت کیا اور بیعت کے ساتھ ہی ساتھ مجاز طریقت بنایا۔

(الف) سلاسل تصوف کی جامعیت: شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ سلاسل تصوف کی جامعیت کے قائل تھے اور اس کے اثرات نمایاں طور پر ان کے مزاج اور طریقہ تربیت میں (جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں) دیکھے جاسکتے ہیں۔

۱۔ ابتدائی ذکر واذکار، فکر وشعور کی بلندی اور روحانی ترقی وعروج کے حوالے سے ان میں سلسلہ ''قادریہ'' کا رنگ نمایاں تھا۔

۲۔ جذب وکیف اور قبولیت عامہ، نیز عوامی رابطے کے لحاظ سے سلسلہ ''چشتیہ'' کا ظہور ہوتا تھا۔

۳۔ سلوک کے ادب وآداب اور نظم ونسق اور انتظامی صلاحیت کے شعور اور طبعی اُنس کے

حوالے سے سلسلہ ''سہروردیہ'' کا اثر دکھائی دیتا تھا۔

۴۔ طبیعت ومزاج میں ٹھہراؤ، عقل وفہم میں پختگی اور فکر وشعور میں ضبط و گہرائی کے حوالے سے سلسلہ ''نقشبندیہ'' کا رنگ غالب تھا۔

۵۔ حضرات مشائخ ''مجددیہ'' کی شریعت، طریقت اور سیاست کے لحاظ سے تجدیدی شان کا رنگ بھی انتہائی پختہ تھا۔

۶۔ ''سلسلہ ولی اللّٰہی'' کے مربوط فکر وفلسفہ اور تجدیدی عمل کی جامعیت، نیز نقل، عقل اور کشف کی بلندتر حالت نے ان کی ذات کو انتہائی نمایاں کر دیا۔(۱۱)

(ب) اجتماعی تزکیہ اور انسانیت: شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے خانقاہی نظام میں انفرادی تزکیہ اور للّٰہیت کے ساتھ اسے اجتماعیت اور انسانیت سے مربوط کیا۔ کیونکہ یہی نقطہ نظر اس منتشر خطے کو ایک وحدت دے سکتا تھا۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کا بیان ہے کہ:

> ''مخلوق کی دل جوئی ومدارات بھی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی کہ ہر شخص یوں سمجھتا تھا کہ حضرت کو سب سے زیادہ محبت میرے ساتھ ہے............ دلداری خلق کا رنگ آپ پر اتنا غالب تھا کہ پیاری سی پیاری چیز اس کے مقابلہ میں ہیچ تھی۔''(۱۲)

شاہ صاحب کے نزدیک تصوف عزلت نشینی ہی کا نام نہیں، ان کے نزدیک تصوف عملیت اور اجتماعی ذمہ داری کے تناظر میں دیکھنے کی چیز ہے۔ کیوں کہ عقل وشعور کی بالیدگی اور قلب کے پختہ عزم وہمت کے ساتھ انسانی سوسائٹی کے لیے بہترین فکر وعمل کی تحریک پیدا کرنا تصوف کا انتہائی اعلیٰ مقصد ہے۔(۱۳)

(ج) دینی وعصری علوم وفنون کی ترویج: ان کو دینی وعصری علوم وفنون کی ترویج کا شوق تھا۔ اس کے لیے ایک مدرسہ ''فیضِ ہدایت'' کے نام سے قائم فرمایا۔ اس کے لیے اپنی زمین اور کتب خانے کو اس مدرسہ کے لیے وقف کر دیا، وہ طلبہ میں جفاکشی، سادگی اور سماجی شعور پیدا کرنے کے قائل تھے۔(۱۴) انہوں نے مفتی کفایت اللہ دہلوی (۱۸۷۵-۱۹۵۳ء) سے ''اصولِ اسلام'' اور ''تعلیم الاسلام'' کے نام کے دو رسائل لکھوائے جن کی اہمیت آج بھی مسلم ہے۔ وہ عصری علوم وفنون کے مخالف نہیں تھے۔

چنانچہ ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' (۱۵) کے لیے جب حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا عبیداللہ سندھی کو تیار کیا تو اس کی تاسیس کی مشاورت اور سرپرستی میں حضرت شاہ صاحب بھی شامل تھے۔

(د) مدارس دینیہ کی ضرورت: مدارس دینیہ کو دین اسلام کے فروغ کے لیے ضروری خیال فرماتے تھے، مولانا رشید احمد گنگوہی کو ان پر اس درجہ اعتماد تھا کہ اپنی حیات ہی میں دارالعلوم کی مجلسِ شوریٰ کا ممبر بنایا۔(۱۶) حضرت گنگوہیؒ کے بعد بھی ان کے قائم مقام کی حیثیت سے انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا، اسی طرح مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کی سرپرستی بھی حضرت گنگوہیؒ ہی کے حکم سے قبول کی۔(۱۷) ان مدارس کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ مکاتب اسلامیہ و مدارس دینیہ کا ایک مربوط نظام قائم فرمایا اور ان مدارس کی تمام عمر سرپرستی اور رہنمائی فرمائی۔ ان کے قائم کردہ مدارس میں ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ ریاضی اور دیگر عصری علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اساتذہ کے لیے ضابطۂ اخلاق بھی تیار کیا گیا تھا۔

(ہ) آزادی کی سوچ اور فلسفہ: انگریز سامراج کے وجود کو وہ مسلمانوں کی غلامی کا باعث قرار دیتے تھے۔ انگریز کے انخلا کے لیے ان کے نزدیک متحدہ قومی جدوجہد ناگزیر تھی۔ چنانچہ ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء میں جب مولانا گنگوہیؒ نے انڈین نیشنل کانگریس کی تائید میں فتویٰ دیا تو مولانا خلیل احمد سہارنپوری (۱۸۵۲ء۔ ۱۹۲۷ء) اور حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی اس کی بھرپور تائید فرمائی۔(۱۸) اسی طرح ''جمعیۃ الانصار'' اور ''نظارۃ المعارف'' کے تحت نوجوانوں میں جس دینی فکر کی تحریک حضرت شیخ الہندؒ نے شروع کی تھی اس کی سرپرستی بھی فرمائی۔ تحریک ریشمی رومال کا آغاز ہوا تو اس میں بھی ان کا بڑا اہم کردار رہا۔ مفتی عبدالخالق آزاد لکھتے ہیں کہ:

> ''(آپ) ''تحریک ریشمی رومال'' کی سرپرستی، رہنمائی اور نگرانی کا کام انتہائی جرأت و ہمت اور بڑی اولوالعزمی کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔ آپ نے اپنے ہمراز دوستوں کے ساتھ مل کر انتہائی جبر و آمریت اور دہشت کے ماحول میں ظالم انگریز کے خلاف آزادی کے حصول کے لیے چلائی جانے والی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور اس کی سرپرستی کی۔''(۱۹)

۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۷ء میں جب حضرت شیخ الہند حجاز تشریف لے گئے، اس کو درست خیال نہیں کیا لیکن بقول مولانا مدنیؒ حضرت شیخ الہندؒ کو اپنا قائم مقام بنا کر گئے۔

پنجاب کی سی آئی ڈی پولیس کے ریکارڈ میں ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی عدم موجودگی میں ان کے نائب کی حیثیت سے وہ کام کرتے رہے۔(۲۱) اگرچہ ''تحریک ریشمی رومال'' ناکام ہوئی، تاہم حضرت رائے پوریؒ نے یہ ضروری سمجھا کہ جیسے ہی حضرت شیخ الہند مالٹا سے واپس تشریف لائیں تو ان کی تحریک کو از سر نو منظم کیا جائے لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ۲۸/جنوری ۱۹۱۹ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ حضرت شیخ الہند جب مالٹا سے واپس تشریف لائے تو اپنے رفیق کی قبر پر تشریف لے گئے اور کافی دیر تک غمزدہ اور خاموش رہے۔

۲۔مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ: شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کا تعلق تھوہا محرم خاں تحصیل تلاگنگ ضلع کیمبل پور (مغربی پنجاب) کے راجپوت علمی گھرانے سے تھا۔ والد حافظ احمد صاحب کو قرآنِ کریم سے خصوصی لگاؤ تھا۔ والدین نے نام غلام جیلانی رکھا۔ جب وہ رائے پور حاضر ہوئے تو شیخ شاہ عبدالرحیم رائے پوری نے ان کا نام عبدالقادر رکھا۔ حافظ احمد صاحب کی شادی ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں موضع ڈھکوال میں ہوئی تھی، جو ڈھڈیاں گاؤں سے تین یا چار میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ لیکن اہلیہ کا کچھ عرصہ بعد انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد تقریباً ساٹھ سال تک انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ ایک مجذوب کی پیشین گوئی پر موضع للیانی ضلع سرگودھا کے ایک معزز خاندان میں دوسرا نکاح کیا اور انہی سے مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری تولد ہوئے۔ سن ولادت کا درست علم تو نہیں، البتہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے بعض قرائن کی روشنی میں ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء کے بعد ان کی ولادت ہونا قرار دیا ہے۔(۲۲) تاہم مجالس حضرت رائے پوری کے مؤلف نے اس کتاب کے مقدمے میں ۱۸۷۵ء کو سن ولادت قرار دیا ہے،(۲۳) مفتی محمد سلیمان قاسمی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔(۲۴)

مروجہ تعلیم کے حصول کے بعد بریلی میں مولانا احمد رضا خاںؒ بریلوی (۱۸۵۶-۱۹۲۱ء) کے بچوں کو کچھ عرصہ پڑھاتے رہے۔ بعد ازاں دہلی تشریف لے گئے۔ اس وقت مسلکی عصبیت کا زور اور فتوؤں کا شور تھا۔ ان کو یہ ماحول پسند نہ آیا۔(۲۵) اسی اثنا میں شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجاہدہ وریاضت کے تمام مراحل طے کیے۔ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے اولاً سلسلہ قادریہ میں پھر بعد میں چاروں سلسلوں میں اجازت وخلافت عطا فرمادی۔(۲۶) حضرت رائے پوریؒ بھی ان سے حد درجہ محبت کرتے تھے۔ اپنے سفر وحضر میں ساتھ رکھتے اور ۱۳۲۷ھ/۱۹۱۰ء میں جب

حج کے لیے تشریف لے گئے تو ان کو بھی ساتھ لے گئے۔قریب چودہ سالہ یہ رفاقت کامل رہی۔جانشینی کے بعد انہوں نے نے خانقاہ رائے پور کو مرجع خاص وعام بنادیا۔انہوں نے خانقاہ کے ماحول کو پر کیف اوراثر انگیز بنادیا۔توازن اوراعتدال کی وجہ سے مسلکی اورفروعی اختلافات سے بالاتر ہوکر ہر طبقے کے لوگ اس خانقاہ کا رخ کرتے ۔ بیعت کے سلسلے میں ان کا معمول بڑا عجیب تھا۔علمائے کرام کو بیعت کرنے میں اگرچہ متامل اورمحتاط تھے مگر عوام کے لیے بہت وسیع الظرف تھے۔

(الف) شیخ الہندؒ کی جماعت کا فکری تسلسل: مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ نے انتقال سے قبل مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ وہ حضرت شیخ الہندؒ اوران کی جماعت کا ہمیشہ ساتھ دیں، چنانچہ جب حضرت شیخ الہندؒ نے جمعیۃ علماء ہند قائم کی تو انہوں نے اس جماعت کے ساتھ مل کر کام کیا اور جو تعلق حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت عالی رائے پوریؒ کے درمیان تھا وہی تعلق شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مابین بھی ہوا۔اسی طرح بعض حضرات نے جب حضرت شیخ الہند کے خاص شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ پر نقد فرمایا تو انہوں نے ان کے شکوک وشبہات کو دور کیا اور فرمایا کہ حضرت شیخ الہند جس کی تعریف کریں میں تو ان کے متعلق نیک گمان ہی رکھتا ہوں۔ حضرت سندھیؒ کا ہمیشہ دفاع کیا۔شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی تعزیت پر جب حضرت شیخ الہندؒ خانقاہِ رائے پور تشریف لائے تو انہوں نے اپنے حق میں دعا کی درخواست کی۔اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا ابھی کیا کچھ کمی ہے کہ دعا کروں۔(۲۷)

(ب) رسوم وقیود سے آزاد مزاج: مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ:

> ”رائے پور کی خانقاہ چونکہ رسوم وقیود سے بہت آزاد اور حضرت کی طبیعت مبارک بہت جامع ، وسیع اور داروگیر سے دور تھی ، نیز مختلف ماحول اورطبقات کے لوگوں کا آپ سے تعلق اورعقیدت اور آپ کو ان سے محبت تھی اس لیے......جدید تعلیم یافتہ اورقدیم مدارس کے فضلاء اپنی اصلاح وتربیت اوراپنے اپنے خلاء کی تکمیل کے لیے حاضر ہونے لگے۔“(۲۸)

(ج) نوجوانوں کی تربیت کا انداز: نوجوانوں سے بہت محبت فرماتے تھے اوراس معاملے میں کالج اور مدرسہ کے نوجوانوں کے ساتھ مساوی رویہ تھا،ان کو قریب کرکے ان کی اصلاح کے قائل تھے۔

۱۔ایک شخص نے لباس کے متعلق عرض کیا تو فرمایا اسلام نے کوئی خاص پوشاک مقرر نہیں فرمائی۔ پوشاک کا مقصد جسم کا ستر ہے، اس لیے جس لباس سے ستر پوشی ہو وہ جائز ہے۔(۲۹)

۲۔ایک نوجوان نے (جو کالج میں پڑھتے تھے) بعض مقاصد کے لیے ''آیتِ کریمہ'' پڑھنے کی اجازت چاہی تو حضرت نے فرمایا اس مالیخولیا میں مت پڑو اور رضائے الٰہی کے لیے پڑھنا سیکھو۔(۳۰)

۳۔ کالج کے ایک نوجوان نے گزارش کی کہ میرے والد کو تحریر کردیں تاکہ میں انگریزی تعلیم چھوڑ دوں۔ فرمایا کہ تم نیت کرلو کہ اس علم سے دین کی خدمت کروں گا۔(۳۱)

(د) **سرمایہ پرستی کی مذمت:** سرمایہ داری اور جاگیردارانہ نظام کی خرابیوں پر نظر تھی، اسی لیے علما کے طبقے سے چاہتے کہ وہ ان عملی مسائل کی طرف متوجہ ہوں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> ''لوگوں کو مذہبی لڑائی کے بجائے اب زمیندار، کاشتکار اور مزدور سرمایہ دار وغیرہ کے سوالات پر لڑنا چاہیے۔ اس سے مذہب کو بدنام کرنے کا قصہ تو ختم ہوجائے گا، ورنہ یہ خیال ہے کہ مذہب بدنام تو اب بھی ہے (مذہبی لڑائی پیدا کی گئی تو) اور بھی زیادہ بدنام ہوجائے گا۔''(۳۲)

(ہ) **سیاسی بصیرت:** ان کی سیاسی بصیرت بڑی گہری تھی۔ اس دور کی تمام تحریکوں، سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کے متعلق جچی تلی رائے رکھتے تھے۔ جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار اسلام اور کانگریس وغیرہ کے بعض لیڈروں کو بروقت نہایت مفید اور قیمتی مشورے دیے۔(۳۳) مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ جو کہ احرار کے بانی تھے، ان ہی سے تعلقِ بیعت رکھتے تھے۔ مسجد شہید گنج اور دیگر کئی مسائل پر جب انگریز نے ''احرار'' کو تشدد کی راہ پر چلانے اور حقیقی مسائل سے دور کرنے کی کوشش کی تو حضرت کی سیاسی فراست نے ''احرار'' کو اس مسئلہ میں الجھنے سے بچایا۔(۳۴)

(و) **اسلامی نظام:** اسلامی نظام کے قیام کے متعلق فرمایا:

> ''اسلامی نظام خالی باتوں سے نہیں قائم ہوسکتا، اگر دنیا کے بڑے ملکوں کے دوش بدوش کھڑے ہونا ہے تو ان لوگوں کے علوم وفنون سیکھنے ہوں گے، مگر مشکل یہ ہے کہ ہم ان کے علوم کو سیکھتے سیکھتے اپنے دین ومذہب کو خیرباد کہہ دیتے ہیں، جب تک کوئی ملک اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو، اس زمانہ میں دین ودنیا کا کوئی کام نہیں کرسکتا۔''(۳۵)

(ز) دین ودنیا کی تفریق: دین دنیا کی تفریق اور ثنویت ان کے نزدیک مناسب نہیں تھی۔ حضرت اس طرزِ فکر کے شدید ناقد تھے، چنانچہ فرماتے تھے کہ:

"نیک نیتی سے ملک کی (سیاسی، معاشی اور دفاعی) طاقت پیدا کرنے کی جو کوشش کی جائے، سب دین ہی ہے...... صالح نیت سے حکومت کی ترقی کا جو بھی کام کیا جائے، سارے کا سارا دین ہی دین ہے۔" (۳۶)

(ح) قومی وبین الاقوامی امور پر نگاہ: خانقاہ میں اکابرین کی کتب پڑھی جاتی تھیں وہیں اخبارات وغیرہ بھی عام خانقاہی ماحول کے برخلاف موجود رہتے۔ مفتی محمد سلیمان قاسمی لکھتے ہیں کہ:

"آپ حالاتِ زمانہ اور بیرونی ممالک کی خبروں سے واقف رہنے کا بڑا اہتمام فرماتے، اخبارات کی اہم خبروں اور اہم مضامین نیز سائنس کی کھوج اور جدید خبروں اور جدید معلومات کے سننے کا ساری عمر اہتمام رہا۔ آپ خبریں سننے کو کبھی کبھی اپنا وظیفہ کہا کرتے تھے۔" (۳۷)

شاہ صاحب کی طبیعت ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء سے کافی خراب رہنے لگی تھی۔ ایسے میں مدرسہ و خانقاہ کی فکر زیادہ دامنگیر تھی، مسلسل مشوروں اور غور وفکر کے بعد مولانا حافظ عبدالعزیز رائے پوریؒ (نواسہ شاہ عبدالرحیم رائے پوری) کو پاکستان سے بلایا گیا اور حضرت کے حکم سے شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے مجمعِ عام میں یہ اعلان فرمایا کہ حضرت نے حافظ صاحب کو یہاں قیام کے لیے راضی کرلیا ہے۔ ۱۳۸۱ھ/ ۱۹۶۲ء میں حضرت نے شدید بیماری کے باوجود پاکستان کا سفر کیا، اس دوران ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی، کچھ افاقہ ہوتا تو ہندوستان واپسی کا تقاضا کرتے۔ بیماری کا یہ سلسلہ ۱۶/ اگست ۱۹۶۲ء کو ختم ہوا اور وہ اپنے خالق حقیقی کے دربار میں حاضر ہوگئے۔

۳۔ مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ: مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کا آبائی وطن "متھلہ" ضلع کرنال ہے۔ وہیں ۱۶/ جولائی ۱۹۰۵ء بروز جمعۃ المبارک پیدا ہوئے۔ قطب عالم مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے نواسۂ حقیقی ہیں۔ (۳۸) والد صاحب چودھری تصدق حسین حضرت گنگوہیؒ سے بیعت تھے۔ شاہ عبدالعزیز نے سات برس مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں رہ کر ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء میں انیس برس کی عمر میں فراغت حاصل کی۔ مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ ان کو سفر وحضر میں اپنے ساتھ

رکھتے اور حد درجہ اعتماد کرتے تھے۔ ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۷ء میں جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو ان کو خاص طور پر اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے (جو کہ اس وقت جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے) خصوصی طور پر ملاقات کروائی۔ حجاز میں ہونے والی ان ملاقاتوں میں جو مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے مابین ہوئیں ان میں صرف مولانا ہی کو شرکت کی اجازت تھی۔ ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۷ء میں جب برعظیم کی تقسیم کا عمل شروع ہوا تو مسلمانوں کے علاقوں میں فسادات کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ علاقہ ''گمتھلہ'' سکھوں کی اکثریت والے علاقے میں واقع تھا۔ وہاں ان حالات کا انتہائی جانفشانی اور پامردی سے مقابلہ کیا اور جب فوج نے اس علاقے سے مسلمانوں کا زبردستی انخلاء کیا تو شیخ سے اجازت لے کر اپنے قافلے کے ساتھ پاکستان تشریف لے گئے اور سرگودھا میں قیام فرمایا۔(۳۹) شیخ کے انتقال کے بعد ہندوستان کے پانچ اسفار کیے اور چھٹا سفر موت کے بعد ہوا۔ ان اسفار میں انہوں نے رائے پور سمیت دہلی، سہارن پور، دیوبند اور مرادآباد وغیرہ میں خانقاہ رائے پور کے متوسلین و متعلقین کو اپنے فیوض سے نوازا۔

(الف) شریعت کی پابندی اور التزام: ان کی شریعت سے محبت اور اکابر سلف کے طریقے پر ثابت قدمی کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ کراچی میں ''جامعہ علومِ اسلامیہ'' میں مقیم تھے۔ ایک دوست کی پرزور دعوت پر شادی میں تشریف لے گئے۔ وہاں مکان کی سجاوٹ میں انتہائی اسراف سے کام لیا گیا تھا۔ حضرت کو ناگواری ہوئی، اس لیے واپس ہوگئے۔(۴۰)

۲۔ ۱۹۸۰ء میں جب جنرل ضیاء الحق نے آئین کو معطل کرکے وفاقی شرعی عدالت قائم کی تو شاہ صاحب نے دیگر آئینی ترامیم کے ساتھ ساتھ ''عائلی قوانین'' پر شدید تنقید کرتے ہوئے اسے خلاف شرع قرار دیا۔(۴۱) اسی طرح اس دور کے نام نہاد ''نظام زکوٰۃ'' اور ''نظام صلوٰۃ'' کے غیر موثر ہونے پر بھی کھل کر بات کی۔ جن علما نے آمریت کا ساتھ دے کر شریعت کے پردے میں سرمایہ داری کو پروان چڑھایا، ان علماء کو ان کی حقیقی ذمہ داری سے آگاہ کیا۔

۳۔ سنت رسول کا اس درجہ اہتمام تھا کہ ایک مرتبہ کسی مجبوری سے کھانے سے قبل ہاتھ نہ دھو سکے تو خدام سے فرمایا کہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آج تک یہ سنت مجھ سے چھوٹی ہو۔(۴۲)

۴۔ان کی خدمت میں جب پانی دم کرنے کے لیے کوئی عرض کرتا تو پہلے ایک گھونٹ پانی پیتے اور پھر دم کر کے دیتے۔اس طرح سُؤرُ الْمُؤْمِنِ شِفَاءٌ (مومن کا جھوٹا شفا ہے) والی حدیث پر بھی عمل ہو جاتا۔اسی طرح اس حدیث کی روشنی میں یہ عادت بھی تھی کہ ایک پلیٹ میں دو افراد مل کر کھانا کھائیں تا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے خیر کا باعث بن جائیں۔(۴۳)

(ب) طریقت اور اجتماعی تزکیہ کا باہمی ربط: ان کے نزدیک اصلاحِ نفس کے لیے اولیاء اللہ کی صحبت بہت ضروری ہے۔(۴۴)

(ج) سیاسی فہم وشعور: شریعت اور طریقت کے ساتھ ساتھ سیاست کا بھی گہرا شعور وادراک رکھتے تھے۔سیاست کو بھی دین کا اہم شعبہ قرار دیتے تھے۔اپنے شیخ کے طرزِ عمل پر اہل حق علماء کی سیاسی تحریکات کی مکمل سرپرستی اور رہنمائی فرمائی۔چنانچہ قادیانیت کے خلاف چلائی جانے والی تحریک ختم نبوت دراصل ان ہی کی سرپرستی اور رہنمائی میں تھی۔

تقریباً تیس سال تک خانقاہ رحیمیہ رائے پور کی مسند کو رونق بخشنے کے بعد ۳؍جون ۱۹۹۲ء کو اس دارفانی سے کوچ فرمایا۔نماز جنازہ جانشین اور فرزند مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ نے پڑھائی اور وصیت کے مطابق نانا مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے برابر میں تدفین ہوئی۔انتقال سے چار سال قبل ۱۴۰۹ھ/ ۱۹۸۸ء میں خانقاہِ رائے پور کی مسجد کے سامنے وسیع میدان میں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کو اپنا جانشین نامزد کیا۔

۴۔مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ: مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ رجب ۱۳۴۴ھ بمطابق جنوری ۱۹۲۶ء اپنے آبائی وطن گمتھلہ ضلع کرنال میں پیدا ہوئے۔(۴۵) اس وقت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کے انتقال کو قریب سات سال گزر چکے تھے۔مسند خانقاہ پر مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رونق افروز تھے۔انھوں نے "سعید احمد" نام رکھا۔"جلالین" تک کی کتب رائے پور میں ہی پڑھیں۔ ۱۳۶۷ھ/ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کا معاملہ پیش آیا تو ان کے والد محترم مولانا عبدالقادر رائے پوری کے حکم پر پاکستان تشریف لے آئے۔لیکن یہ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے ساتھ رہے،ارادہ یہ تھا کہ درسِ نظامی کے تکمیل کے آخری دو سال مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں مکمل ہوں۔مدرسہ مظاہر العلوم میں تعلیم کے دوران قیام وطعام شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے گھر پر رہا۔تکمیل کے بعد

مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے پاس واپس رائے پور تشریف لے آئے۔ شوال ۱۳۶۸ھ بمطابق اگست ۱۹۴۹ء میں مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ رائے پور تشریف لائے اور حضرت رائے پور ثانیؒ سے فرمایا کہ ''مولوی سعید احمد کو مزید ایک سال کے لیے مجھے دے دیں تاکہ تکمیل (منطق، فلسفہ وغیرہ علوم) میں وقت لگائیں۔ اس پر حضرت نے فرمایا:

''بس جی! ہم نے جتنا اپنے برخوردار مولوی سعید احمد کو پڑھانا تھا پڑھا لیا، اس سے آگے نہیں پڑھانا۔ ہم نے کوئی اسے محض مدرس بنانا ہے۔''(۴۶)

یوں ان کی ظاہری تعلیم مکمل ہوئی اور حضرت رائے پور ثانیؒ کی زیر سرپرستی باطنی تعلیم کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا اور کامل ایک سال (۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۰ء) میں سلوک کی تکمیل کی۔(۴۷)

(الف) دینی وعصری طلبا کا اشتراک فکر وعمل: دینی وعصری تعلیم میں باہمی اتحاد و اتفاق کی غرض سے ۱۲/ مارچ ۱۹۶۷ء میں ایک تنظیم ''جمعیۃ طلبائے اسلام'' قائم کی، جس کے ذریعہ عصری تعلیمی اداروں کے طلبہ کی فکری تربیت کا ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ جمعیۃ بیس سال تک (۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۷ء) مولانا کی سرپرستی میں کام کرتی رہی۔ اس دوران اس جماعت نے تحریک ختم نبوت سمیت دیگر قومی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ فارغ طلبہ کے لیے ۱۹۸۷ء میں ملتان میں علما اور فضلا کے ایک اجلاس میں ''تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی'' قائم کی۔

(ب) قرآنی تعلیمات عام کرنے کی کوشش: ان کی خواہش تھی کہ عوام الناس میں بالعموم اور نوجوانوں میں بالخصوص قرآنی تعلیمات کو عام کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء میں ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور کے نام سے ادارہ قائم کیا، جس کے اہداف ومقاصد یہ تھے:

۱۔ علوم قرآنیہ کی بنیادی اور حقیقی تعلیمات نوجوان نسل کے سامنے پیش کرنا۔

۲۔ انسانی سماج کی تشکیل کے بنیادی علوم اور ان کے قرآنی اصول سے واقفیت بہم پہنچانا۔

۳۔ علوم قرآنیہ کی اساس پر روحانی، اخلاقی اور شعوری تربیت کا اہتمام کرنا۔(۴۸)

(ج) دین اسلام کی جامعیت: دورِ حاضر میں خانقاہی نظام کے زوال کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کا خیال تھا کہ آج خانقاہیں دین کے جامع فلسفے کی تربیت میں ناکام ہوگئی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''آج خانقاہی نظام دم توڑ رہا ہے۔ پہلے شریعت یعنی دین کی تعلیم، طریقت

یعنی روحانیت کی طرف رجوع اور شریعت پر عمل کرنے کے لیے محرک اور سیاست یعنی راستہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے کا مدبرانہ انداز، یہ دین کے تینوں شعبے مل کر کام کیا کرتے تھے اور ان سب کی سرپرستی کا شرف خانقاہِ رائے پور کو حاصل تھا۔ خانقاہِ رائے پور آج کے اس گئے گزرے دور میں بھی الحمدللہ دین کا کام کرنے والوں کے لیے ایک چھاؤنی کی حیثیت رکھتی ہے۔''(۴۹)

(د) تصوف کی مروجہ اصطلاحات کی اصلاح: ان کا یہ تجدیدی کارنامہ ہے کہ تصوف کی رائج اصطلاحات کے حقیقی مفہوم، اثرات اور تقاضوں کی وضاحت نئے انداز سے کی ہے۔ مثلاً

۱۔ ''صبر'' کے مروجہ قنوطی تعریف کے برعکس واضح کرتے ہیں کہ صبر کا معنی ہے اپنے پروگرام میں جم جانا کہ حالات نامساعد ہوں، مشکلات درپیش ہوں اور لوگ پروگرام کو ٹھکرائیں لیکن پروگرام پر یقین میں پختگی پیدا ہوتی چلی جائے۔(۵۰)

۲۔ ''توکل'' کے بارے میں فرمایا کہ اگر عمل اختیار کیے بغیر گھروں میں بیٹھ کر فتح یابی کی دعا ہو اور اس سے خدائی فیصلوں کا انتظار ہو تو یہ دعا محض آرزو اور خواہش ہے۔ یہ عمل اور قربانی سے روکنے والی ہے۔(۵۱)

۳۔ ''زہد'' کا مفہوم یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دنیا سے بالکل کنارہ کر لیا جائے لیکن دنیا کی نعمتیں انسان کے لیے ہیں۔ اللہ ان سے روکتا نہیں ہے لیکن ان کی محبت دل میں بٹھانا تباہی ہے اور انعامات کا ملنا اور دل سے باہر رکھنا یہ نعمت ہے۔(۵۲)

(ہ) دین کا مقصد اخلاقی بلندی: ان کے مطابق جب معاشروں پر زوال آتا ہے تو ان میں یہ نظریہ رکھتے تھے کہ جو لوگ ظلم کے سرپرست اور دنیا پر ظلم کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں ان کا تعلق خواہ کسی دین اور مذہب سے ہو وہ انسانیت کی اجتماعی ترقی میں رکاوٹ اور کل انسانیت کے دشمن ہیں۔ اللہ رب العزت اس انسان کو عزیز رکھتے ہیں جو مخلوق کے ساتھ اخلاق سے پیش آئے، مخلوق کیساتھ اس کو ہمدردی پیدا ہو جائے۔

(و) غلبہ دین کی سوچ اور علمائے عصر کا طرز عمل: اس سلسلہ میں ان کا یہ قول بڑا فکر انگیز ہے کہ:

''پچپن سال سے ہمارے اکثر علماء اسی پرانی سوچ اور طریقہ پر اڑے

ہوئے ہیں جو ہمارے بزرگوں نے انگریز کے دورِ غلامی میں عارضی طور پر مسلمانوں کو تحفظ دینے اور بچانے کا راستہ اختیار کیا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد علماء کو مکمل دین کی تعلیم کے فروغ اور مکمل دین کے غلبہ کا راستہ اختیار کرنے اور اسی کی رہنمائی دینے کی ضرورت تھی لیکن ہمارے علماء نے اس جامع سوچ کو نہ اپنایا اور اپنے آپ کو محض درس وتدریس تک محدود کرلیا۔" (۵۴)

(ز) فرقہ واریت اور گروہیت کی نفی: فرقہ پرستی، تعصب اور تخریب کی اصل میں مضمر خرابی پر ان کی نظر کو ان الفاظ میں دیکھنا چاہیے:

"آج حنفی، توحیدی اور سنی ہونے کے اعتبار سے فرقہ واریت کا شدید تعصب محض جزوی تعصب ہے، جو باہمی اتحاد کا مظاہرہ کر کے دینی انقلاب تو کبھی پیدا نہیں ہونے دیتا لیکن یہی فرقہ پرست، بے دین ظالم سرمایہ دار طبقے کے اشاروں پر ضرور جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ، دہریہ جماعتوں اور شریعت کا مذاق اڑانے والوں کا ساتھ دے سکتے ہیں لیکن اپنی دینی جماعت سے مل کر نہیں چل سکتے۔" (۵۵)

(ح) عصری علوم کے حاملین کی تربیت: عموماً ہمارے مذہبی حلقوں میں عصری علوم کے حامل نوجوانوں کے متعلق یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ یہ بے دین ہیں۔ اس عمل سے نوجوان میں نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں لیکن حضرت کا طریقہ تربیت اس سے مختلف تھا۔ اس سلسلے میں پروفیسر عبدالودود علیمی نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

"شیخ مکرم و معظم کا یہ طریقِ احسن رہا ہے کہ نوجوانوں کو وعیدیں سنا کر نہیں، بلکہ نویدوں اور بشارتوں سے ان کے قلوب واذہان میں دین سے محبت پیدا فرماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طبقہ فکر ونظر کا نوجوان حضرت کی شفقت ومحبت اور نظریات و خیالات سے متاثر نظر آتا ہے۔"(۵۶)

(ط) سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت: سرمایہ دارانہ نظام کے سخت مخالف تھے۔ جو قومیں سرمایہ داریت کی آڑ میں دیگر اقوام کا استحصال کر رہی ہیں اور جو مذہبی نمائندے اس سرمایہ دارانہ نظام کو سندِ جواز فراہم کر رہے ہیں وہ انہیں انسانیت کا دشمن سمجھتے تھے۔ مولانا عبداللہ عابد سندھی لکھتے ہیں کہ:

”وہ سرمایہ داری نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ دینا چاہتے تھے، بایں وجہ ان مذہبی مقتدر قوتوں کے بھی خلاف تھے جو سرمایہ دار اور سامراج کے آلہ کار بن کر غلبہ دین کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔“(۵۷)

(ی) جدید علوم وفنون سے استفادہ: ترقیات کے حصول کے لیے جدید سائنسی علوم سے استفادہ ناگزیر ہے، اس لیے ان کی تحصیل بھی غیر اسلامی ہے قطعاً درست نہیں۔ یہ حضرت کی فکر کا نمایاں پہلو رہا۔(۵۸) اسلام اور مغرب کے تعلقات کے حوالے سے ان کی فکر یہ تھی کہ ان کے علوم وفنون اور نظم و نسق جیسی خصوصیات اخذ کرنے کو خلافِ اسلام نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس حوالے سے خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرْ (اچھی چیز لے لو اور بری چیز چھوڑ دو) کے اصول پر کاربند تھے۔ وہ مغرب کی تہذیب سے زیادہ اس کے ظالمانہ نظام کی مخالفت کرتے تھے۔

نتیجہ بحث: نتیجہ بحث یہ کہ مشائخ رائے پور نے اپنے دور کی روایتی خانقاہوں کے برعکس دینی، فکری اور شعوری میدان میں بھر پور کردار ادا کیا۔ اس خانقاہ کو جہاں اہلِ حق علماء کی تائید اور سرپرستی حاصل رہی، وہیں اس خانقاہ نے اپنے دور کی اہم تحریکات کی سرپرستی بھی کی اور ان تحریکات کو سامراج کے ہاتھوں استعمال ہونے سے روکے رکھا۔ اس خانقاہ کے مشائخ نے انفرادیت پسندی کی سوچ کی نفی کرتے ہوئے اجتماعی اصلاحی رجحانات کو فروغ دیا۔ نیز فرقہ واریت اور مذہب کو گروہی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی نفی کی۔ اس خانقاہ کے مشائخ نے سرمایہ دارانہ سوچ کی سخت مذمت کی اور خود کو محض روحانیت تک محدود رکھنے کی بجائے اسلام کے حقیقی معاشی نظام کو بھی اجاگر کیا۔ تقسیم کے عمل کے بعد اس خانقاہ نے اپنا سیاسی و تحریکی کردار بھی جاری رکھا۔ چنانچہ اس خانقاہ کے بزرگ مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ نے اس خطے میں دینی فکر کے فروغ اور عملی تشکیل کے حوالے سے مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری کی مکمل تربیت فرما کر مستقبل میں کردار ادا کرنے کے لیے تیار کیا، جنھوں نے تقسیم کے بعد کے حالات میں جب کہ نئی نسل دینی فکر اور اس فکر کی حامل جماعت کی جدوجہد سے ناآشنا ہوتی جارہی تھی، اس فکر کو مکمل ایمان داری سے نئی نسل میں منتقل کیا اور انہیں اپنی تاریخ کے حقیقی کرداروں سے متعارف کرایا۔ انہوں نے اس خطے کی نوجوان نسل کو اپنی فکر کا موضوع بناتے ہوئے دین کے جامع فلسفے کے تناظر میں ان کی تربیت فرمائی۔ یہ بات درست ہے کہ غلبہ دین کے قدیم روایتی تصورات کے برعکس

اپنے جدید رجحانات اور تصورات کے باعث اس خانقاہ کے بعض مشائخ سے قدامت پسند مذہبی طبقے کی طرف سے بعض اختلافات بھی سامنے آئے۔ خانقاہ کا ماننا ہے کہ شرعی اور روحانی نظام کو غالب کرنے کے لیے سیاسی نظام کا ہاتھ میں ہونا بہت ضروری ہے، اس لیے تہذیب وتمدن بھی اسی قوم کا غالب ہوگا جس کا سیاسی نظام غالب ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس خانقاہ کے مشائخ کے ''فلسفہ جامعیت دین'' کو اجاگر کیا جائے تاکہ سوسائٹی میں شریعت، طریقت اور سیاست کی جامع فکر تشکیل پائے۔ یقیناً اس عمل سے جہاں خانقاہی نظام کے حقیقی فلسفے کو سمجھنے میں مدد ملے گی وہیں دین کے عصری اور سماجی تقاضوں کا شعور بھی حاصل ہوگا، جس کی ہمارے سماج کو سخت ضرورت ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) امینی، بشیر احمد، مولانا، فیضان مشائخ رائے پور، میوات، جامعہ رحیمیہ ٹرسٹ، ۲۰۱۲ء، ص ۷۔ (۲) ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ایک طرف تو دارالعلوم کا مدرسہ اس خطے کی استعماری قوتوں کے خلاف آزادی کے لیے مصروف عمل تھا تو دوسری طرف گنگوہ، سہارن پور اور رائے پور کی خانقاہیں بھی تعمیر باطن کا کام کر رہی تھیں۔ مولانا انظر شاہ (فرزند علامہ انور شاہ کشمیری) لکھتے ہیں کہ ثقہ طور پر معلوم ہوا ہے کہ آزادی وطن تک ان (خانقاہوں) میں خفیہ ''بیعت جہاد'' بھی لی جاتی تھی۔ (ان خانقاہوں کا مقصد) برٹش اقتدار کے خلاف ان جذبات پر مبنی تھا کہ تخت یا تختہ۔ تفصیل ملاحظہ ہو: مسعودی، انظر شاہ، نقشِ دوام، دیوبند، مطبع دیوبند، س۔ن، ص ۲۰۶۔ (۳) آزاد، عبدالخالق، سوانح شاہ عبدالرحیم رائے پوری، سہارنپور، کتب خانہ یحیوی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱۱۔ (۴) سہ ماہی شعور وآگہی، ج ۵، شمارہ ۱، ص ۸، جنوری۔ مارچ ۲۰۱۳ء، لاہور۔ (۵) آپ کا آبائی قصبہ گمتھلہ ضلع کرنال ہے، گمتھلہ کو آج سے تقریباً ساڑھے سات سو سال پہلے چوہان راجپوت قوم کے ایک فرد بھیم چندرم نے آباد کیا تھا۔ ''گمتھلہ'' اصل میں ''گن تھلہ'' تھا، سنسکرت میں ''گن''، علم کی اساس پر روحانی گیان ودھیان کے لیے استعمال ہوتا ہے ''تھلہ'' اونچی جگہ کو کہتے ہیں۔ گویا ''گن تھلہ'' کا مطلب ہوا ''گیان ودھیان کی بلند جگہ''۔ کثرت استعمال سے ''گن تھلہ'' تبدیل ہوکر ''گمتھلہ'' ہوگیا۔ اس کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقام علمی وروحانی اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ (۶) خاندانی طور پر یہ روایت مشہور ہے کہ ''بابا طاہر خاں'' حضرت شرف الدین بوعلی قلندر کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ تاہم یہ روایت درست نہیں ہے۔ کیونکہ بوعلی قلندر کا زمانہ (۶۰۴ھ/ ۱۲۰۸ء تا ۷۲۴ھ/ ۱۳۲۴ء) سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر سلطان غیاث الدین تغلق تک کا عہد ہے جبکہ اس خاندان کے قلمی شجرۂ نسب

میں ”طاہر خاں“ کے مسلمان ہونے کا زمانہ (۹۶۳ھ/ ۱۵۵۶ء تا ۱۰۱۴ھ/ ۱۶۰۵ء) شہنشاہ اکبر کا زمانہ ہے۔ اس لئے درست یہ ہے کہ وہ بوعلی قلندر کے سلسلہ کے کسی بزرگ کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ (۷) میرٹھی، عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید، لاہور، مکتبہ مدنیہ، ۱۴۰۶ھ، ج ۲، ص ۱۵۵۔ (۸) آپ کے اساتذہ میں مولانا مظہر نانوتوی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا احمد حسن کانپوری اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری جیسے حضرات شامل تھے، جو ولی اللّٰہی جماعت کے انتہائی اہم افراد تھے۔ (۹) میاں عبدالرحیم سہارنپوری کے مربی اور شیخ حضرت اخوند عبدالغفور سواتی نے انگریز سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ ان ہی کی کوششوں سے سوات و بنیر میں قبائل کی آزاد ریاست قائم ہوئی تھی۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر میں تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ (۱۰) رائے پوری، حبیب الرحمٰن (مرتب)، ارشادات (مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری)، لاہور، سید احمد شہید اکیڈمی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۵۳۔ (۱۱) سہ ماہی شعور و آگہی، ج ۵، شمارہ ۱، ص ۱۹، جنوری۔ مارچ ۲۰۱۳ء، لاہور۔ (۱۲) میرٹھی، عاشق الٰہی، تذکرۃ الخلیل، سیالکوٹ، مکتبہ قاسمیہ، ۱۹۶۹ء، ص ۲۴۵، ۲۴۶۔ (۱۳) سہ ماہی شعور و آگہی، ج ۵، شمارہ ۱۰، ص ۴۲، جنوری۔ مارچ ۲۰۱۳ء، لاہور۔ (۱۴) میرٹھی، عاشق الٰہی، تذکرۃ الخلیل، ص ۲۴۰۔ (۱۵) اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند نے ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں ”جمعیۃ الانصار“ قائم کی اور مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا احمد امروہیؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کو جمع کر کے زمانے کی موجودہ ضرورتیں ان کے سامنے پیش کیں اور انہیں اس کام میں معاونت کو کہا۔ مولانا تھانویؒ نے تو معذرت فرمالی البتہ باقی حضرات نے موافقت کی۔ مولانا سندھیؒ نے ”جمعیۃ الانصار“ کو قدیم طلباء کی تنظیم سے آگے بڑھا کر اس میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی شامل کیا اور یقیناً یہ عمل انہوں نے شیخ الہندؒ کے حکم پر کیا تھا۔ تاہم دارالعلوم کے اندرونی حالات مولانا محمد احمد (فرزند مولانا نانوتوی و مہتمم دارالعلوم) کے اہتمام میں کافی تبدیل ہو چکے تھے جو دارالعلوم کو سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب مدرسہ کو حضرت شیخ الہندؒ کی قائم کردہ ”جمعیۃ الانصار“ ایک آنکھ نہ بھائی اور انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس پر شیخ الہندؒ نے باہمی محاذ آرائی سے بچنے کی خاطر ”جمعیۃ الانصار“ کا مرکز تبدیل کر کے دہلی منتقل کر دیا اور ”نظارۃ المعارف القرآنیۃ“ کے نام سے ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء میں دہلی میں مولانا سندھیؒ ہی کی نظامت میں اس نے کام شروع کیا، جس کا مقصد جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سیاسی تربیت کرنا اور شاہ ولی اللہ کے فکر و فلسفہ کے مطابق ہندوستان کے معروضی حالات میں سیاسی رہنمائی کرنا تھا۔ (۱۶) محبوب رضوی، تاریخ دارالعلوم دیوبند، لاہور، المیزان ناشران و تاجران کتب، ۲۰۰۵ء، ج ۱، ص ۲۰۷۔ (۱۷) محمد زکریا، مولانا، تاریخ مظاہر العلوم، سہارنپور، کتب خانہ اشاعت العلوم، ۱۳۹۲ھ، ج ۱، ص ۹۰۔ (۱۸) حضرت گنگوہیؒ کے انتقال (۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کے بعد خانقاہِ گنگوہ سے وابستہ تمام ادارے، تحریکات اور مراکز کی رہنمائی اور سرپرستی ان کے سپرد ہوگئی۔ دارالعلوم دیوبند میں حضرت نانوتویؒ

کے وصال (۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۰ء) کے بعد اساتذہ میں جوفکری تقسیم ہوئی تھی اس نے اس ادارے کے فاضلین کو بھی فکری وتربیتی اعتبار سے تقسیم کر دیا تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ کی سیاسی فکر اور فہم وشعور کا حامل طبقہ اپنی تربیت کو موثر بنانے کے لیے عام طور پر حضرت شیخ الہندؒ کے مشورے سے ''خانقاہِ رائے پور'' کا رخ کرتے تھے جبکہ غیر سیاسی اور غیر تحریکی مزاج کا حامل طبقہ ''خانقاہِ تھانہ بھون'' کا رخ کرتا تھا۔ (۱۹) سہ ماہی شعور وآگہی، ج ۵، شمارہ ۲، ص ۹، اپریل۔ جون ۲۰۱۳ء، لاہور۔ (۲۰) مدنی، حسین احمد، نقش حیات، کراچی، دارالاشاعت، س۔ن، ج ۲، ص ۶۲۴۔ (۲۱) محمد میاں، سید، ریشمی خطوط کے کیس میں کون کیا ہے؟، دہلی، الجمعیۃ بک ڈپو، س۔ن، ص ۸۰۔ شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد جب ان سے اس تحریک کی بابت انگریز نے سوال وجواب کیا تو انھوں نے برملا اپنی شرکت اور اس تحریک کی سرپرستی کا اظہار کرتے ہوئے عزیمت کی راہ اختیار کی۔ (۲۲) ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ص ۳۱۔ (۲۳) رائے پوری، حبیب الرحمٰن (مرتب)، مجالس حضرت رائے پوری، لاہور، مکتبہ سید احمد شہید، ۱۹۹۶ء، ص ۳۷۔ (۲۴) قاسمی، محمد سلیمان، مختصر حالات زندگی حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، کراچی، ادارۃ المعارف، ۲۰۰۹ء، ص ۳۵۔ (۲۵) ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، ص ۵۱۔ (۲۶) قاسمی، محمد سلیمان، مختصر حالاتِ زندگی، ص ۶۹، ۷۰۔ (۲۷) رائے پوری، حبیب الرحمن، ارشادات (مقدمہ)، ص ۳۵۔ (۲۸) ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، ص ۲۲۰۔ (۲۹) رائے پوری، حبیب الرحمٰن، مجالس حضرت رائے پوری، ص ۱۲۵۔ (۳۰) رائے پوری، حبیب الرحمٰن، ارشادات، ص ۱۲۹۔ (۳۱) مرجع سابق، ص ۱۸۱۔ (۳۲) رائے پوری، حبیب الرحمٰن، ارشادات، ص ۷۵۔ (۳۳) عبدالرشید ارشد، برصغیر پاک وہند کے بیس بڑے مسلمان، لاہور، مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۶۹ء، ص ۶۰۹۔ (۳۴) آزاد، عبدالخالق، مشائخ رائے پور، لاہور، دارالتحقیق والاشاعت، ۲۰۰۶ء، ص ۷۷۔ (۳۵) ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، ص ۲۷۹۔ (۳۶) مرجع سابق، ص ۲۷۹۔ (۳۷) قاسمی، محمد سلیمان، مختصر حالاتِ زندگی، ص ۱۷۹۔ (۳۸) ان کا نام ''عبدالعزیز'' بھی حضرت گنگوہیؒ کے ایماء پر حضرت عالی رائے پوریؒ نے تجویز فرمایا۔ گمان یہ ہے کہ نام کی یہ نسبت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کی طرف ہے۔ ملاحظہ ہو: آزاد، عبدالخالق، مشائخ رائے پور، ص ۱۱۷، ۱۱۸۔ (۳۹) ندوی، ابوالحسن علی، سوانح حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، ص ۲۰۵۔ (۴۰) مجلہ عزم (سیریز نمبر ۱۲۰)، ص ۱۷، مئی۔ جون ۱۹۹۳ء، ملتان۔ (۴۱) انھوں نے ڈاکٹر محمود الحسن عارف (سابق مدیر اردو دائرہ معارف اسلامیہ) کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ اس غلط قانون کے خلاف مواد اکٹھا کریں اور قانونی میدان میں اس کی جنگ لڑیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو: مجلہ عزم (سیریز نمبر ۱۱۲)، ص ۱۶، جولائی۔ اگست ۱۹۹۲ء، ملتان۔ (۴۲) مجلہ عزم (سیریز نمبر ۱۲۰)، ص ۱۶، مئی۔ جون ۱۹۹۳ء، ملتان۔ (۴۳) عزیمت (سیریز نمبر ۹)،

ص ۱۶-۱۵،شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن۔(۴۴) شیخ کی نوجوانوں سے محبت وشفقت کے حوالے سے ڈاکٹر محمد عبدالمقیت شاکر لکھتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالعزیز رائے پوری کی یوں تو ہرادا پسندیدہ تھی، مگر میں نے خصوصیت سے یہ بات نوٹ کی کہ وہ نوجوانوں پر خصوصی توجہ مرکوز رکھتے تھے،ان کے ہر ہر عمل پر پوری نظر تھی۔ وہ جانتے تھے کہ تعلیم یافتہ نوجوان ہی معاشرتی زندگی میں انقلاب بر پا کرسکتا ہے...... میں اس زمانے میں داڑھی نہیں رکھتا تھا،اس بنیاد پر انہوں نے نہ مجھ پر فاسق وفاجر کا حکم لگایا، نہ دھتکارااور نہ ہی مجھ سے کنارہ کش رہے بلکہ اس کے برعکس بہت محبت سے ملے۔ملاحظہ ہو:عزیمت (سیریز نمبر ۹)،ص ۱۷،شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن۔(۴۵) آزاد،عبدالخالق، مشائخ رائے پور،ص ۱۷۹۔(۴۶) روایت حضرت رائے پوری رابع مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری قدس سرہ۔سہ ماہی شعور وآگہی ،ج ۴،شمارہ ۴،ص ۳۴، اکتوبر- دسمبر ۲۰۱۲ء، لاہور۔(۴۷) مولانا بشیر احمد امینی لکھتے ہیں کہ حضرت رائے پوری ثانی زیارت کے لیے آنے والے علماء سے فرماتے کہ اس نوجوان (شاہ سعید احمد رائے پوری) کی باتیں غور سے سنو۔وہ اپنے شیخ کی موجودگی میں دین اسلام کے عصری تقاضوں پر گفتگو فرماتے۔ملاحظہ ہو:امینی، بشیر احمد،مولانا، فیضان مشائخ رائے پور،ص ۱۷۳۔ (۴۸) سہ ماہی شعور وآگہی، ج ۴،شمارہ ۴،ص ۳۴،اکتوبر-دسمبر ۲۰۱۲ء،لاہور۔(۴۹) مجلہ عزم (سیریز نمبر ۹۴-۹۳)،ص ۳۴،ستمبر-اکتوبر ۱۹۹۰ء، ملتان۔(۵۰) مجلہ عزم (سیریز نمبر ۴۶)،ص ۹، جولائی ۱۹۸۲ء، لاہور۔(۵۱) مرجع سابق،ص ۱۰۔(۵۲) مجلہ عزم (سیریز نمبر ۱۶۲)،ص ۱۷-۱۶،جنوری-فروری ۱۹۹۸ء، ملتان۔(۵۳) مجلہ عزم (سیریز نمبر ۲۶۲)،ص ۶،ستمبر ۲۰۱۲ء،ملتان۔(۵۴) مجلہ عزم (سیریز نمبر ۲۴۹)، ص ۱۳،نومبر-دسمبر ۲۰۱۰ء،ملتان۔(۵۵) مجلہ عزم (سیریز نمبر ۳۸)،ص ۹، جولائی ۱۹۸۱ء،ملتان۔(۵۶) پروفیسر محمد عبدالودود علیمی کا یہ مکتوب گرامی (۷ مارچ ۲۰۱۰ء) شعور وآگہی، اپریل۔جون ۲۰۱۰ء، ج ۲، شمارہ ۲،ص ۱۱۹ میں شائع ہوا تھا۔(۵۷) مجلہ عزم (سیریز نمبر ۲۶۵)،ص ۹،جنوری-مارچ ۲۰۱۳ء،ملتان۔ (۵۸) شیخ فرماتے ہیں کہ آج دنیا میں صرف علم کی بنیاد پر ترقیات ہورہی ہیں۔سائنسی ترقیات کے منصوبے بنتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ٹیکنالوجی میں اتنی ترقی ہونے کے باوجود عام آدمی خوش حال کیوں نہیں ہے......صرف علم اگر نور ہے تو پھر اس کی روشنی عام کیوں نہیں ہوتی؟ میری اس بات پر آج کا نوجوان فوراً سوال کرے گا کہ موصوف علم کے مخالف ہیں؟ ترقیات نہیں چاہتے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے۔میں تو ان کو سوچنے کی دعوت دیتا ہوں کہ اسلام کے ظہور سے پہلے جب پوری دنیا میں استحصالی نظام تھا کیا اس وقت ان کے پاس علم نہیں تھا؟......ہم نوجوانوں کے لیے ترقیات کے دروازے کھولنا چاہتے ہیں۔ہم نوجوانوں کے علم کو روشنی دینا چاہتے ہیں۔ہم ان میں قومی سوچ اور قیادت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ملاحظہ ہو:مجلہ عزم (سیریز نمبر ۱۳۴)،ص ۸،۷،اکتوبر ۱۹۹۴ء،ملتان۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور قصص القرآن

(۲)

کلیم صفات اصلاحی

قصص القرآن جلد سوم کے موضوعات ومباحث: اس جلد میں بعض انبیاء علیہم السلام کے علاوہ اصحاب الجنۃ، اصحاب القریۃ، حضرت لقمانؑ، اصحاب سبت، اصحاب الرس، بیت المقدس اور یہود، ذوالقرنین، سد سکندری، اصحاب الکہف والرقیم، سبا اور سیل عرم، اصحاب الاخدود اور اصحاب الفیل کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، بالخصوص قرآن کے بیان کردہ وہ واقعات جن کو متعصب مستشرقین بے سروپا داستان اور غیر تاریخی قصے کہتے ہیں، مولانا سیوہاروی نے ان کو صحیح اور مستند اسلامی وغیر اسلامی تاریخی حقائق کی روشنی میں ثابت کیا ہے۔ مولانا کو یہ تسلیم ہے کہ قرآن نے بعض واقعات مثالاً محض موعظت ونصیحت کے طور پر پیش کیے ہیں جن کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں ہے لیکن بعض مفسرین نے ان تمثیلی واقعات کو بھی ماضی کے حقیقی گذشتہ واقعات سے منسوب ومنسلک کر دیا ہے، مولانا فرماتے ہیں ''ہم نے ایسے مواقع پر واضح کر دینا ضروری سمجھا کہ اس واقعہ کی حقیقت ایک ''مثال'' سے زیادہ نہیں ہے'' (۵۶) لیکن مولانا سیوہاروی اسی کے ساتھ ان کے ہم زبان بھی نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''لیکن اگر کوئی شخص اس کو واقعات ماضی کی ایک کڑی سمجھتا ہے تب بھی ان واقعات کو واقعات تسلیم کر لینے میں نہ کسی اچنبھی بات کو تسلیم کرنا لازم آتا ہے اور نہ ایسے واقعات کا غیر تاریخی ہونا ان کے ''مثال'' بننے میں حارج ہو سکتا ہے، مثلاً ''مومن وکافر'' یا اصحاب الجنۃ، باغ والوں کا واقعہ، کہ قرآن کا مقصد ان کے بیان کرنے سے صرف حسب حال ایک ''مثال'' دینا ہے خواہ وہ ماضی میں گزرا واقعہ ہو یا نہ ہو''۔ (۵۷)

رفیق دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

اصحاب الجنۃ: سورۃ القلم، آیت نمبر ۱۷ میں اللہ تعالیٰ نے اصحاب الجنۃ کا واقعہ بطور تمثیل بیان کیا ہے کہ جس طرح باغ والوں نے خدا کی نعمت کو ٹھکرایا اور شکرانِ نعمت نہیں کیا، اسی طرح اصحاب مکہ نے بھی آنحضورؐ جیسی عظیم الشان نعمت پاکر اس کی عزت وتوقیر نہیں کی تو اب باغ والوں کی طرح ان کا بھی وہی نتیجہ ہوگا کہ وہ باغ کے نفع سے محروم کردیے گئے، مولانا کی تحقیق کے مطابق حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کفار مکہ کے حالات کے مناسب اس کو محض ایک مثالی واقعہ قرار دیا ہے لیکن سعید ابن جبیرؓ کے مطابق یہ صنعا سے چھ میل دور ایک بستی ضروان کا واقعہ ہے۔(۵۸)

سورۂ کہف میں مومن وکافر کا واقعہ: سورۂ کہف میں اصحاب کہف کے واقعہ کے بعد دو شخصوں کی مناظرانہ گفتگو پر مشتمل ایک واقعہ کا ذکر ہوا ہے، مولانا کی تحقیق کے مطابق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ کفار مکہ اور مسلمانوں کو پیش نظر رکھ کر تذکیر ونصیحت کے لیے بطور مثال یہ واقعہ بیان ہوا ہے، یہ بات نہیں ہے کہ درحقیقت یہ واقعہ مومن وکافر کے درمیان ماضی میں پیش آیا تھا لیکن جمہور کے قول کے مطابق نزول قرآن سے قبل اصحاب کہف کی طرح حقیقتاً یہ واقعہ پیش آیا تھا،(۵۹) مولانا کا خیال ہے کہ قرآن نے اس واقعہ کا جس انداز سے ذکر کیا ہے کتب احادیث وسیر اور تاریخ میں اس سے زیادہ کچھ اور موجود نہیں ہے، لہٰذا ہمارے لیے وہی قابل مراجعت ہے،(۶۰) اس کے بعد پورا واقعہ نقل کیا ہے۔(۶۱)

شاہ عبدالقادرؒ نے اس واقعہ (۶۲) کی جو تفصیل پیش کی ہے اس سے مولانا سیوہاروی نے اختلاف کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ”معلوم نہیں کہ حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ نے واقعہ کی یہ تفصیل کہاں سے اخذ فرمائی، کتب سیر وروایات اور تاریخ کے اوراق تو اس بارہ میں خاموش ہیں اور ”چھوٹا منہ بڑی بات“ حضرت شاہ صاحب نے اس واقعہ میں جس طرح دونوں کا تقابل ظاہر فرمایا ہے قرآن کا ظاہر سیاق اس کی تائید نہیں کرتا، اس لیے کہ مرد مومن نے کافر کے غرور کا جو جواب دیا اور کافر نے جو اس کے افلاس پر طعنہ دیا وہ ہرگز اس صورت حال کے مناسب نہیں ہیں کہ مومن حقیقتاً مالدار تھا مگر اس نے اپنا سارا مال راہ خدا میں خرچ کردیا تھا، اگر ایسا ہوتا تو مومن وکافر کے سوال وجواب کا اسلوب دوسرا ہوتا۔ واللہ اعلم“۔(۶۳)

اصحاب القریہ یا اصحاب یٰسین کے تذکرہ میں مولانا سیوہاروی نے لکھا ہے کہ چند مقدس پیغمبروں نے ایک گمراہ مخلوق کو سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کی، انہوں نے ازراہِ عناد ان پیغمبروں کی نہ صرف تکذیب کی بلکہ ان کو قتل کر دیا، (۶۴) اس کے بعد مقام واقعہ، وجود وسنہ واقعہ، عذاب کی کیفیت یعنی چیخ وغیرہ کے سلسلہ میں ارباب سیرت وتفسیر نے جو روایات نقل کی ہیں اور اس سلسلہ میں محدثین نے جو اقوال تحریر کیے ہیں ان پر تبصرہ کیا ہے، اس واقعہ کی جزئی تفصیلات کے سلسلہ میں مولانا کی یہ بات اہم ہے کہ یہ اسرائیلی روایات سے ماخوذ ہیں، تفصیلی جزئیات کے لحاظ سے غیر تاریخی بلکہ تاریخی مسلمات کی تردید کرتے ہیں اور قرآن عزیز کے ظاہر سیاق کے بھی خلاف ہیں، (۶۵) یہاں بھی عبرت کے پہلو بیان کیے ہیں۔ (۶۶)

اسی طرح حضرت لقمانؑ کے ذکر میں لقمان، نبوت یا حکمت، چند تفسیری مطالب، حسن خلق ،تواضع ، کبروغرور، حکمت لقمانؑ، مواعظ وغیرہ عناوین کے تحت تفصیلی حالات قرآن واحادیث کی روشنی میں نقل کیے ہیں (۶۷) اور اصحاب سبت کا ذکر ہے جس میں مسخ شدہ قوموں کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عکرمہؒ کا مکالمہ بھی آ گیا ہے اور مفسرین نے واقعہ مسخ کے مقام کے متعلق متعدد اقوال نقل کیے ہیں، مدین، متنا، عینونا وغیرہ کے نام لیے گئے ہیں لیکن مولانا سیوہاروی نے بحر قلزم پر واقع بستی ایلہ کے متعلق راجح قول کی نشاندہی کی ہے۔ (۶۸)

زمانہ مسخ کے متعلق حضرت شاہ عبدالقادر نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں پیش آیا، مولانا سیوہاروی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کے اسلوب بیان اور جلیل القدر مفسرین کی شرح وتفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب سبت کا یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کے درمیانی زمانہ میں کسی ایسے وقت پیش آیا جب کہ ایلہ میں کوئی نبی موجود نہیں تھے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ وہاں کے علمائے حق ہی کے سپرد تھا اس لیے قرآن عزیز نے صرف انہیں کا تذکرہ کیا اور کسی نبی یا پیغمبر کا ذکر نہیں کیا۔ (۶۹)

مسخ یعنی خنزیر و بندر ہو جانے سے مسخ حقیقی (صوری) یا مسخ معنوی کیا مراد ہے؟ مولانا اس ضمن میں اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ ان کا حقیقی مسخ ہوا تھا، مسخ معنوی یعنی مسخ قلوب ان کے نزدیک حکمت وموعظت کے خلاف ہے، ان کے مطابق یہ حکمت تو جب ہی صحیح ہو سکتی ہے کہ انسانوں کو

حقیقی طور پر بندر کی شکل میں مسخ کر دیا گیا ہو، (۷۰) مولانا نے مفسرین کے اقوال کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیتے ہوئے جدید سائنسی اکتشافات و نظریات کے حوالہ سے مفصل گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت اختیار کر لینا عقلاً کوئی مستبعد نہیں ہے جو انکار مسخ پر وارد ہو سکے۔(۷۱)

اصحاب الرس کے متعلق لکھتے ہیں کہ لغت میں ''رس'' کے معنی پرانے کنوئیں کے ہیں، اصحاب الرس یعنی کنوئیں والے، قرآن میں سورۂ فرقان اور سورہ ''ق'' میں ان کا ذکر آیا ہے اور انبیاء کی تکذیب اور استہزاء کے سبب جو قومیں ہلاک و تباہ ہوئیں ان میں ان کا نام بھی ہے، مولانا نے اس کی تفصیلات میں تفسیر ابن کثیر، مسعودی، اوستا وغیرہ کے بیانات اور صاحب ارض القرآن کی تحقیقات سے تعرض کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰؑ سے قبل قوم تھی، مولانا نے اس کو زردشت کی تعلیمات سے متاثر بتایا ہے۔(۷۲)

ذوالقرنین کے ذکر میں ساری تفصیلات کے بعد لکھتے ہیں کہ مستشرقین یورپ ذوالقرنین اور یاجوج ماجوج اور سد سکندری کے وجود کی حقیقت تسلیم نہیں کرتے، ان کا کہنا ہے کہ یہ عرب کی ایک فرسودہ داستان اور بے سروپا کہانی ہے جس کو وحی الٰہی کی حیثیت دے دی گئی ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قرآن کے بیان کردہ اس واقعہ کی اٹل حقیقت ثابت کرے اور بتائے کہ معترضین نے صرف عصبیت کی بنا پر اس حقیقت کا انکار کیا ہے اور ان کا انکار بلاشبہہ جہل، ظن و تخمین اور باطل مزعومات کا طومار ہے، (۷۳) چنانچہ مولانا ذوالقرنین کے متعلق محدثین، مفسرین، سیرت نگار، اناجیل کے بیانات کا عالمانہ جائزہ لیا ہے، علمائے سلف کی رائے میں ذوالقرنین عربی الاصل، سامیہ میں اور حضرت ابراہیمؑ کا معاصر تھا، مولانا فرماتے ہیں کہ اس تحقیق میں کئی فروگذاشتیں ہیں جو اس تحقیق کو متردد اور مضطرب رائے میں تبدیل کر دیتی ہیں (۷۴) متاخرین کی رائے میں تو بعض نے اسی غلط بات کو اختیار کر لیا ہے اور سکندر مقدونی کو ذوالقرنین مانا ہے اور بعض نے بغیر دلیل حمیر کے ایک بادشاہ کو ذوالقرنین مانا ہے، (۷۵) ان تمام اقوال میں مولانا آزاد کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ قرآن کے بیان کردہ حقائق کے پیش نظر ہر طرح لائق ترجیح ہے، (۷۶) مولانا آزاد نے خورس کو ذوالقرنین مانا ہے، جس کو مولانا سیوہاروی کے مطابق خورس، یونانی سائرس، فارسی گورش اور عرب کیخسرو کہتے ہیں، (۷۷) مولانا نے قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں

خورس یا کیخسر و کو ذوالقرنین ثابت کرنے کی کوشش کی اور ان آیتوں کے مطالب کا تجزیہ کرکے خورس سے متعلق تاریخی واقعات کا استقصا کیا ہے، آخر میں اپنا فیصلہ سناتے ہیں ''قرآن عزیز کی ان آیات میں ذوالقرنین کا جو واقعہ مذکور ہے اگر اس کو ان واقعات کے ساتھ تطبیق دیجیے جو گذشتہ صفحات میں تورات اور تاریخ قدیم کے حوالہ جات سے نقل کیے گئے ہیں تو آپ خود یہ فیصلہ دیں گے کہ یہ تاویلات تخمینی قیاس آرائیوں اور غیر معلوم احتمالات سے محفوظ رہ کر ذوالقرنین کا اطلاق خورس کے سوا اور کسی شخص پر نہیں ہوتا۔(۷۸)

مولانا نے اس واقعہ کو حقیقی ثابت کرنے کے لیے جو دلائل فراہم کیے ہیں ان سے اس کی وہ اساطیری اور افسانوی حیثیت یقیناً ختم ہوگئی جو مستشرقین یورپ نے علمی و تحقیقی دنیا کو باور کرانے کی کوشش کی تھی۔(۷۹)

مولانا نے اسی طرح یاجوج ماجوج اور سد پر بڑی چشم کشا گفتگو کی ہے اور اپنے اختیار کردہ موقف کی تائید میں قرآنی الفاظ و بیانات کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ مولانا کے مطابق قفقاز اور تفلس کے درمیان واقع درہ ذاریال جو پہاڑوں کی دو چوٹیوں کے مابین گھرا ہے، واثق باللہ کے کمیشن نے اس کے متعلق اپنے مشاہدہ میں بیان کیا ہے کہ لوہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے تیار کی گئی ہے، قرآن کے بیان کیے ہوئے دونوں وصف اسی دیوار پر منطبق ہوتے ہیں اس لیے یہی سد ذوالقرنین ہے''۔(۸۰)

اصحاب کہف والرقیم کے ذیل میں مولانا کا قلم ان کے اسلوب کا پورا ساتھ دیتا ہے۔(۸۱)

اصحاب الاخدود یا قوم تبع کے ضمن میں اخدود، اصحاب اخدود اور قرآن، واقعہ کی تفصیلات، انتقاد، تبع عرب کی دو حکایتیں، چند تفسیری نکات اور بصائر وغیرہ کے عناوین زیر تحقیق آئے ہیں۔

اصحاب الفیل کے ضمن میں حبش، حکومت، نجاشی، مذہب و تمدن، حبش و یمن کی کشمکش، ابرہۃ الاشرم، القلیس، اصحاب الفیل، قرآن اور اصحاب الفیل، سورۂ فیل اور بعض دیگر تفسیر، چند تشریحی مطالب اور بصائر و عبر کے عناوین سے تحقیقات پیش کی ہیں۔

مولانا نے اصحاب فیل کے سلسلہ میں جمہور کے مسلک کو اختیار کیا ہے کہ ابرہۃ الاشرم نے کعبہ پر اپنے عظیم الشان لشکر کے ذریعہ چڑھائی کی، اللہ تعالیٰ نے معجزانہ طور پر چھوٹی چھوٹی چڑیوں کے ذریعہ کنکریوں کی مار سے اس نے اس کے لشکر کو ہلاک و برباد کردیا جس کا مقصد کعبہ کی حفاظت تھا۔

مولانا کے مطابق یہ تفسیر لغت عرب کی مطابقت، سلف صالحین سے منقول روایات اور تاریخی تواتر کے پیش نظر بغیر کسی ردو انکار کے تیرہ سو سال سے قابل قبول رہی ہے، لیکن گذشتہ پچاس ساٹھ سال کے اندر بعض حضرات نے سلف کے خلاف روش اختیار کی اور تفسیر بالرائے کا سہارا لے کر اس کی من مانی تفسیر کی، اس ضمن میں مولانا نے سرسید اور مولانا فراہی کی تحقیقات کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا ہے، سرسید کے متعلق مولانا سیوہاروی لکھتے ہیں کہ وہ ''طیر'' سے پرندنہیں بدفالی مراد لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لفظ کنایۃً بلا و مصیبت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ عربی میں بدفالی کے لیے ''طائر'' استعمال ہوتا ہے، ''طیر'' نہیں، سرسید کے متعلق ان کا یہ کہنا ہے کہ ''ان کی یہ تفسیر سرتا سر اغلاط اور لغو تاویلات پر مبنی ہے...... اس لیے علمی مباحث میں جگہ پانے کے لائق نہیں ہے'' بڑی جرأت کی بات ہے۔ (۸۲)

مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے ترمی کا فاعل مولانا سیوہاروی کے بقول ''طیر'' کو نہ مان کر ''الم تر'' کے فاعل کی طرح ''انت'' کو مانا ہے، اس تفسیر پر مولانا سیوہاروی نے چھ اعتراضات (۸۳) کیے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ تفسیر سلف اور جمہور کی تفسیر سے قطع نظر کر کے صرف عربیت اور اشعار عرب کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ (۸۴)

جلد چہارم کے موضوعات ومباحث: اس جلد میں مولانا سیوہاروی نے حضرت عیسیٰؑ بن مریم اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ان واقعات وسوانح کا استقصاء اور مبصرانہ و ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے، پوری جلد ۵۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، حضرت عیسیٰؑ کے حالات میں وہ مباحث خاص طور پر زیر بحث آئے ہیں جو قرآن کے دلائل کی روشنی میں ان کی زندگی اور توراۃ وانجیل کے مضامین الٰہیات سے متعلق ہیں، آپؑ کے عمومی حالات تو ہر زبان میں موجود ہیں، مولانا نے اپنی اس کتاب میں صرف ان ہی واقعات زندگی پر تحقیقی نگاہ ڈالی ہے جن کا براہ راست تعلق قرآنی آیات و تعلیمات سے ہے، ترتیب زمانی کے لحاظ سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کے حالات زندگی سپرد قلم کیے ہیں اور درج ذیل عناوین کے تحت بڑی معرکہ آرا گفتگو کی ہے۔

مولانا سیوہاروی حضرت مریمؑ کے نبی ہونے کے قائل ہیں، ان کا بیان ہے کہ حضرت مریمؑ کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ سورۂ مریم میں ان کا ذکر اسی اسلوب میں کیا گیا ہے جس میں دوسرے نبیوں کا تذکرہ ہے، اسی طرح ملائکہ نے ان کو جس انداز سے ان سے خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعویٰ کی

روشن دلیل ہے، پھر نبوتِ عورت کے امکان وعدم امکان پر بحث کرتے ہوئے امام الحرمین کے اس دعویٰ کی تردید کی ہے کہ عورتوں کے نبی نہ ہونے پر اجماع ہے اور آخر میں لکھتے ہیں کہ ''دوسری عورتوں کے مقابلہ میں حضرت مریمؑ کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں''۔(۸۵)

قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کے چار معجزات کا بصراحت ذکر کیا ہے: احیاءِ موتی، پیدائشی نابینا کو بینائی اور جذامی شخص کو صحت دینے، مٹی سے پرندہ بنا کر اس میں روح پھونکنے اور اس پرندہ کا یہ بتانا کہ اس نے کیا کھایا، کیا خرچ کیا اور کیا ذخیرہ محفوظ ہے، اس کے علاوہ خود ان کی پیدائش بھی معجزانہ طریقہ پر ہوئی، حضرت عیسیٰؑ کے ان معجزات پر اعتراضات کا مولانا سیوہاروی نے خاص طور پر جائزہ لیا ہے اور معترضین بالخصوص یہود اور ہندوستان کے بعض مفکرین اور دانشور سرسید، مولوی چراغ علی، مدعی نبوت مرزا قادیانی اور لاہوری کے اس دعویٰ کہ ''قرآن نے دنیا میں احیائے موتی کو ممنوع قرار دیا ہے'' کو خود قرآنی آیات کے ذریعہ غلط قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ پورے قرآن میں کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات ملے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت دینے کے بعد حیاتِ تازہ بخشی ہے،(۸۶) قرآن سے اس دنیا میں احیائے موتی ثابت ہے، مرزا قادیانی اور لاہوری کا یہ دعویٰ خود ان کے دماغ کی اپج ہے جو قطعاً باطل اور غیر ثابت اور اس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔(۸۷)

نزول مائدہ کی بحث میں لکھتے ہیں کہ حواری عیسیٰؑ نے حضرت عیسیٰؑ سے کہا کہ آپ اللہ سے ہمارے لیے غیب سے ایک دسترخوان کی دعا کر دیجیے تا کہ ہم کو فراغِ خاطر حاصل ہو جائے اور ہم یادِ الٰہی اور تبلیغ حق میں اس جانب سے بےفکر ہو کر ہمہ تن مصروف ہو جائیں، ان کے اصرار کو دیکھ کر حضرت عیسیٰؑ نے دعا کی اور دعا اس شرط کے ساتھ قبول ہوئی کہ اس کھلی نشانی کے بعد اگر کسی نے حکم عدولی اور سرتابی کی تو دردناک عذاب کے لیے بھی وہ تیار رہے۔ مولانا سیوہاروی فرماتے ہیں کہ یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں، قرآن یا کسی مرفوع حدیث میں اس کی کوئی تفصیل موجود نہیں ہے۔(۸۸) مولانا کی تحقیق کے مطابق مجاہد اور حسن بصری اس کے عدم نزول لیکن جمہور اس کے نزول کے قائل ہیں البتہ نزول کی تفصیلات میں اختلاف ہے، کوئی ایک اور کوئی چالیس دن تک نازل ہونے کا قائل ہے، بند ہونے کا سبب حکم کی خلاف ورزی کو قرار دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں خلاف ورزی کے مرتکبین کو خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ

کردیا گیا۔(۸۹) مولانا سیوہاروی نے اس ضمن میں اپنا کوئی واضح موقف نہیں پیش کیا ہے، ان کے نزدیک صرف اتنی باتیں لائق توجہ ہیں جتنی قرآن میں موجود ہیں۔

رفع عیسیٰؑ کے سلسلہ میں یہود و نصاریٰ کے مزعومات باطلہ کا رد قرآن اور مستند احادیث کی روشنی میں کیا ہے، بالخصوص تلبیس قادیانی کے تارو پود بکھیر دیے ہیں، جدید سائنسی اکتشافات کی روشنی میں رفع سماوی کی عقلی توجیہات بھی پیش کی ہیں جو قابل مطالعہ ہیں۔(۹۰)

اسی طرح عقیدۂ تثلیث، روح القدس اور آخر میں عقیدۂ کفارہ سے متعلق یہودیوں اور نصاریٰ کی بدعقیدگیوں اور بے بنیاد نظریات کی دلنشیں، مدلل اور انتہائی عقلی و نقلی تردید کی ہے، عقیدۂ کفارہ کے متعلق ان کا یہ کہنا کہ ''اس عقیدہ کے قوام بنانے کے لیے چند ضروری اجزا کی ضرورت تھی، جن کے بغیر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے عہد رسول میں سب سے پہلے مسیحیت نے یہودیت کے اس عقیدہ کو تسلیم کرلیا کہ ان کو صلیب پر چڑھایا گیا اور مار بھی ڈالا گیا اور اس کو شرفِ قبولیت دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ ''الوہیت کے باوجود مسیح کا صلیب پانا اور قتل ہونا اپنے لیے نہیں بلکہ کائنات کے لیے تھا، چنانچہ اس پر یہ حادثہ گزر گیا تو اس نے پھر الوہیت کی چادر اوڑھ لی اور عالم لاہوت میں باپ اور بیٹے کے درمیان دوبارہ لاہوتی رشتہ قائم ہوگیا''۔(۹۱) نعوذ باللہ۔

اسی بحث پر اس قصہ عیسیٰ کا خاتمہ ہوگیا، البتہ اس میں بصائر و عبر جو عموماً ہر نبی اور اس کے قصہ سے نتیجہ کے طور پر قارئین کے لیے بطور نمونہ تحریر کرتے ہیں، یہاں مفقود ہیں۔

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوانح زندگی کا استقصاء درج ذیل عناوین کے تحت کیا ہے:

محمد اور قرآن، بشارات النبیؐ، صبح سعادت، تاریخ ولادت کی تحقیق، نسب مبارک، یتیمی، بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق، حقیقت وحی، صاحب وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل، بعثت، حدیث بخاری، بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق، نبی اور مصلح، کیفیت وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی، نزول وحی کا پہلا دور، نزول وحی کا دوسرا دور، دعوت و ارشاد کی پہلی منزل، دعوت و ارشاد کی دوسری منزل، دعوت و ارشاد کی تیسری منزل (بعثت عامہ)، دعوت اسلام کا مجمل خاکہ، قرآن اور تجدید دعوت، توحید و رسالت، یوم آخرت، اسرا (معراج)، ہجرت، غزوات، غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوۂ خندق یا احزاب، واقعہ حدیبیہ، معاہدۂ صلح، فتح مکہ (الفتح الاعظم)، حاطب بن بلتعہ کا واقعہ، بت شکنی،

خطبہ غزوہ حنین، غزوہ تبوک اور قبول توبہ کا عجیب واقعہ، غزوات اور نتائج و بصائر، تبنی، خرافی داستان، بصائر، بصیرت، واقعہ افک، موعظت بناء فاسق، موعظت، مسجد ضرار، وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ، عبرت و موعظت۔

اس کے علاوہ جن آیات میں آپؐ کے اسماء اور صفات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا اور ''یا ایھا النبی'' اور ''یا ایھا الرسول'' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے، مولانا نے ان کی تفصیل اس طرح تحریر کی ہے، اس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ محمد، احمد، ذاتی نام اور عبداللہ، شاہد، مبشر وغیرہ جیسے صفاتی اسماء کس سورۃ کی کس آیت نمبر میں آئے ہیں، مولانا کے مطابق اس قسم کے ذاتی اور صفاتی اسماء والقاب کی قرآن میں کل تعداد ۲۹ ہے۔(۹۲)

مولانا کے مطابق آپؐ کی ولادت ۹ ربیع الاول ۲۰/اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی، سال ولادت کا استنباط مولانا نے سورۂ فیل کی آیات سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''بہرحال عام الفیل نبی اکرمؐ کی ولادت باسعادت کا سال ہے اور یہ واقعہ آپؐ کے ظہور قدسی کا سب سے بڑا قریبی نشان ہے۔(۹۳)

کیفیت وحی کے متعلق بعض مستشرقین کا یہ اعتراض ہے کہ یہ وحی کی نہیں ہسٹریا کی کیفیت ہے جو آپؐ پر طاری ہوتی تھی، العیاذ باللہ۔ مولانا سیوہاروی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ یورپ روحانی علوم اور ماوراء مادیات کے منکر ہیں اور اسلام سے شدید تعصب رکھتے ہیں اس لیے آپؐ پر وحی و الہام کا انکار کرتے ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ یہ مستشرقین آپؐ کی صداقت و امانت کو تسلیم، آپؐ کی تعلیمات حق کی مدح اور کائنات انسانی کے لیے آپؐ کی تعلیمات کو ''تعلیم کامل'' تصور کرتے ہیں، اس کے باوجود کیفیت وحی کو مرض سے تعبیر کرتے ہیں، سبحانك ھذا بھتان عظیم پھر ان کے اعتراض پر یہ سوال کھڑا کرتے ہیں کہ کیا ہسٹریا کے دوروں کا مسلسل شکار کوئی شخص علمی و عملی صلاحیتوں، معاشی و معادی حکمتوں اور دینی و دنیوی رفعتوں کے لیے کوئی ایسا مکمل اور بے نظیر ضابطہ پیش کرسکتا ہے جس کی رفعت و بلندی کا اعتراف دشمن بھی کرتے ہوں، اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر مستشرقین کا یہ دعویٰ کس درجہ حقیر اور بے وقعت ہوجاتا ہے۔(۹۴)

واقعہ معراج کا ذکر بھی قرآن میں ہے، مولانا نے اس واقعہ کی وحدت، اس کے تاریخ وسنہ وقوع، واقعہ کی نوعیت اور قرآن وحدیث میں اس واقعہ کے ذکر کی تفصیلات نہایت محققانہ انداز میں

پیش کی ہے، ان کے مطابق یہ واقعہ ہجرت کے ایک یا ڈیڑھ سال قبل پیش آیا اور جلیل القدر محدثین نے ۲۷ رجب کی تاریخ پر مہر تصدیق ثبت کی ہے،(۹۵) مولانا نے معراج جسمانی و روحانی میں جسمانی کے قائل ہیں اور اس کے مستند دلائل پیش کیے ہیں اور یہ فیصلہ سنایا ہے کہ ''قرآن عزیز اور احادیث صحیحہ کے بغیر کسی تاویل کے بصراحت یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسرار و معراج کا واقعہ بجسد عنصری اور بحالت بیداری پیش آیا ہے''۔(۹۶)

آپ ؐ کی زندگی کا عظیم الشان واقعہ، ہجرت مدینہ، قرآن کی آیات سے استنباط کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ سورۂ بنی اسرائیل از ابتدا تا انتہا ہجرت مدینہ کے ہی اسرار و لطائف سے معمور ہے، (۹۷) اور رب ادخلنی مدخل صدق سے مکہ سے خروج اور مدینہ کی ہجرت کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور یہ ذکر آخر سورت تک جاری رہتا ہے،(۹۸) ختم نبوت کی بحث میں قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ کے حوالہ سے انتہائی حکیمانہ گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ خدا کے قانون ارتقا کے مطابق جب انسان اپنے عقل و شعور میں حد بلوغ تک پہنچ گیا یا اس کے سامان پوری طرح مہیا ہو گئے تب نبوت و رسالت کو بھی بہ حد کمال و تمام پہنچا کر ختم کر دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ الی آخر الآیۃ۔(۹۹)

غزوۂ بدر تاریخ اسلام میں معرکہ حق و باطل کی پہلی جنگ ہے، قرآن مجید میں اس کا مفصل تذکرہ ہے، مولانا سیوہاروی نے بھی اس موضوع پر خاطر خواہ تحقیق پیش کی ہے اور سیرت و تاریخ اور تفسیر و حدیث کی کتابوں میں موجود واقعات کا بھرپور جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، قدیم و جدید سیرت نگاروں کے اس سلسلہ میں تحقیقی آرا سے بھی تعرض کیا گیا ہے، تاہم غزوۂ بدر کے سلسلہ میں مولانا شبلی نے جمہور کے خلاف خصوصی نقطہ نظر کی بحث میں عام جمہور کی رعایت کا دم بھرنے کی کوشش کی ہے، مولانا شبلی نے اس پوری بحث میں قرآنی آیات اور مستند احادیث کو مرکزی اہمیت دے کر باقی روایتوں کا درایتی نقطہ نظر سے جائزہ لیا اور جمہور سے ہٹ کر اپنا موقف اختیار کیا۔ انھوں نے ٹھوس علمی بنیادوں پر اپنے موقف کی بنیاد رکھی ہے، اس لیے مولانا سیوہاروی کا یہ قول کہ ''مولانا شبلی مرحوم نے آرنلڈ کی رہنمائی کے لیے یا اس کی تقلید میں اس واقعہ کے تمام نقشہ کو جمہور کے خلاف اس لیے پلٹنے کی سعی فرمائی ہے کہ وہ وقت کے عیسائی مستشرقین کے اس اعتراض سے مرعوب ہو گئے ہیں کہ قافلہ کا لوٹنا انتہائی

معیوب بات ہے، لہٰذا جو شخص نبوت کا مدعی ہو، وہ کیسے ایسا فعل کرسکتا ہے"۔(۱۰۰) بلا دلیل ہے۔ مولانا شبلی کے دلائل کو کمزور دکھانے کے لیے انہوں نے جو احادیث اور روایتیں پیش کی ہیں ان کے محاکمہ وتجزیہ کے بعد ہی کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔اس قسم کے تجزیہ کا یہاں موقع نہیں، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی کا مشن ہی مستشرقین کے بے بنیاد الزامات کی تردید اور قرآن واسلام کا مدلل دفاع کرنا بنایا تھا۔ان کی تمام تصنیفات اس کی شاہد ہیں،تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ اس سلسلہ میں آرنلڈ کی تقلید کرتے۔

مختصر یہ کہ مولانا نے قرآن مجید میں حضور پاکؐ کی زندگی اور وفات سے متعلق جو واقعات براہ راست بیان ہوئے ہیں ان کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور زید ابن حارثہ، واقعہ افک،غزوات احد، احزاب یا خندق،واقعہ حدیبیہ، فتح مکہ،حنین، تبوک اور قبول توبہ کی تفصیلات، بنونضیر،مسجد ضرار اور آخر میں وفات نبویؐ کا قرآن میں جس انداز سے ذکر ہے،ان سب کا محققانہ انداز میں استقصاء کیا ہے،تاہم بعض واقعات مثلاً سورۂ تحریم میں "یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ج تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ" کے مشہور واقعہ کے متعلق کوئی تفصیل اس حصہ سیرت میں نظر نہ آئی، حالانکہ آنحضورؐ کے واقعات زندگی میں اس کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

خلاصہ مبحث: ان چاروں جلدوں کے مطالعہ سے مولانا سیوہاروی کے متعلق جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ مولانائے محترم نے اردو زبان میں پہلی بار قرآن مجید میں بیان کردہ واقعات امم سابقہ کی مستند تحقیق پیش کی اور ان واقعات کی صحت پر مستشرقین کی جانب سے جو اعتراضات کیے گئے تھے ان کا محققانہ جواب دیا ہے، واقعات اور نبیوں کے اخلاقی اوصاف وکمالات سے متاخرین کے لیے پندوموعظت اور عبرت ونصیحت کے کیسے کیسے چشم کشا نتائج حاصل ہوتے ہیں، ان کی جانب خاص توجہ دی ہے اور تقریباً ہر قوم کے واقعہ اور ہر نبی ورسول کے قصص سے اخذ نتائج کا اہتمام کیا ہے، اسرائیلی روایات کا زیادہ حصہ محرف ہے، اس لیے عموماً وہی روایات استدلالاً پیش کی ہیں، جن کی تائید قرآن مجید، مستند احادیث اور جدید اثری اکتشافات سے ہوتی ہو، ان مستند مصادر سے معارض اور متناقض روایتوں کا تجزیہ کرکے ان کی بے حقیقتی اور بے وقعتی کو مزید واضح کردیا ہے۔غیر مسلم مفکرین اور دانشوروں کے علاوہ خود مسلمان علما اور محققین سے قرآنی آیات کے رموز واسرار کو سمجھنے اور تفسیری اور

حدیثی روایات کے تجزیہ میں جو چوک اور غلطی ہوئی ہے مولانا سیوہاروی نے ان کے سبب اثر کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کے دلائل کی کمزوری دکھائی ہے، نقد و تبصرہ میں دامن متانت ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اسلوب نہایت سادہ اور عام فہم اختیار کیا ہے، کسی بھی تصنیف کی سب سے اہم خوبی مصنف کا اصل موضوع کی جانب پوری احتیاط اور دانشمندی سے انہماک و توجہ کرنا ہے، مولانا نے اس کا خصوصی خیال رکھا ہے جس کے سبب قاری پوری طرح کتاب کے ساتھ بندھا رہتا ہے، اس سے الگ نہیں ہو پاتا، اس کے لیے وسعت مطالعہ اور تحقیقی و تدقیقی نگاہ درکار ہے، مولانا کی اس کتاب کا تقریباً ہر صفحہ اس کا گواہ ہے، ضمنی مآخذ کا اس کتاب میں بہت کم گزر ہوا ہے، کتاب کو جو وصف اپنی جانب خاص طور پر متوجہ کرتا ہے، وہ ان کا قدیم و جدید بالخصوص اس موضوع پر اپنے عہد کے مواد پر خصوصی نظر رکھنا ہے، سر سید، مرزا قادیانی، چراغ علی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا آزاد وغیرہ کی تحریریں اور جدید سائنسی اکتشافات وغیرہ کو مولانا نے خاص طور پر اپنی میزان تحقیق پر رکھا ہے، اناجیل اربعہ، صحاح ستہ، تفسیر ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، فتح الباری، قصص الانبیاء للنجار، الفصل فی الملل والاہواء والنحل، ابن حزم دائرۃ البستانی، معجم البلدان، یاقوت حموی، تفسیر قرطبی، مروج الذہب، مسعودی، الکامل لابن اثیر، تفسیر البحر المحیط، تفسیر طبری، روح المعانی وغیرہ جیسے اہم مصادر سے کتاب مزین ہے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا نے اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں کس قدر اہتمام کیا تھا، البتہ یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ مولانا سیوہاروی نے گرچہ کہیں کہیں اپنی رائے کو بلا تکلف اپنے معاصرین کے اقوال پر ترجیح دینے اور اپنے دلائل کو زیادہ قوی اور مستحکم بتانے کی کوشش کی ہے، تاہم اپنے مسلک جمہور کی شدید وکالت میں وہاں بھی ان کی حمایت میں کھڑے ہیں جہاں عقیدہ کا کوئی مسئلہ نہیں، حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ امور و مسائل جن کا تعلق عقیدۂ توحید و رسالت اور آخرت سے نہیں ہے، مسلک جمہور کے خلاف جانا کوئی گناہ یا قابل نفریں نہیں بلکہ تقلید جامد کے خلاف اجتہاد کو اپنانا بشرطیکہ صاحب اجتہاد کو دین میں تفقہ حاصل ہو، مستحسن قدم ہے۔

حواشی

(۵۶) جلد ۳، ص ۹، جمال پرنٹنگ پریس دہلی، طبع دہم ۱۹۷۱ء۔ (۵۷) ایضاً۔ (۵۸) جلد سوم، ص ۱۱ تا ۱۳۔

(۵۹) ایضاً، ص ۱۳۔ (۶۰) ایضاً، ص ۱۶۔ (۶۱) ایضاً۔ (۶۲) دیکھیے، ص ۱۷۔۱۸۔ (۶۳) واقعہ کی تفصیل اس کتاب کے صفحہ ۲۰ پر ملاحظہ ہو۔ (۶۴) ایضاً، ص ۲۰۔۲۱۔ (۶۵) ایضاً، ص ۲۸۔ (۶۶) ایضاً، ص ۲۹۔ (۶۷) ایضاً، ص ۳۱۔ (۶۸) دیکھیے، ص ۳۴ تا ۴۸۔ (۶۹) ایضاً، ص ۵۷۔ (۷۰) ایضاً، ص ۵۹۔ (۷۱) ایضاً، ص ۶۳۔ (۷۲) ملاحظہ ہو: ص ۶۷۔ (۷۲) ایضاً، ص ۸۰ تا ۸۲۔ (۷۳) ایضاً، ص ۱۲۱۔ (۷۴) ایضاً، ۱۴۱۔ (۷۵) ایضاً، ص ۱۵۵۔ (۷۶) ایضاً، ص ۱۵۶۔ (۷۷) ایضاً، ص ۱۶۵۔ (۷۸) ایضاً، ص ۱۸۳۔ (۷۹) دیکھیے: ص ۱۸۳ تا ۱۹۰۔ (۸۰) ایضاً، دیکھیے ص ۲۱۷ تا ۲۱۹۔ (۸۱) ایضاً، ص ۳۳۰۔ (۸۲) ایضاً، ص ۳۷۴۔۳۷۵۔ (۸۳) دیکھیے، ص ۳۷۶۔۳۷۷۔ (۸۴) ایضاً، ص ۳۷۶۔ (۸۵) جلد ۴، ص ۳۶، یونین پرنٹنگ پریس دہلی، طبع ہشتم ۱۹۷۰ء۔ (۸۶) یہ پوری بحث ص ۶۶ تا ۷۰ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (۸۷) ایضاً، ص ۷۰۔ (۸۸) ایضاً، ص ۸۵۔ (۸۹) تفصیلات، ص ۸۵۔۸۶ میں ملاحظہ فرمائیں۔ (۹۰) یہ تفصیلات ص ۱۰۸۔۱۲۷ میں ملاحظہ فرمائی جائیں۔ (۹۱) ایضاً، ص ۲۲۱۔ (۹۲) ایضاً، ص ۲۱۳ تا ۲۱۶ میں تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ (۹۳) ایضاً، ص ۲۵۶۔ (۹۴) ایضاً، ۳۱۴۔۳۱۵۔ (۹۵) ص ۳۴۲۔ (۹۶) ایضاً، ص ۳۵۳۔ (۹۷) ایضاً، ص ۳۶۹۔ (۹۸) ایضاً، ص ۳۷۰۔ (۹۹) ایضاً، ص ۳۸۷۔ (۱۰۰) ایضاً، ص ۴۳۲۔۴۳۳۔

مراسلات معارف

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

شذرات، مقالات، ادبیات، اخبار علمیہ، مطبوعات جدیدہ، باب التقریظ والانتقاد، آثار علمیہ تاریخیہ، استفسار علمیہ، تلخیص وتبصرہ جیسے مستقل موضوعات نے معارف کے صفحات کو روز اول سے ایسے گلدستہ کی شکل میں پیش کیا جس کے ہر گل، رنگ و بوجدا ہوتے ہوئے بھی ایک پوری بہار کا لطف و کیف عطا کرتا رہا، معارف کی ان پر معرفت تحریروں میں ایک اور بھی موضوع ہے اور وہ ہے معارف کے قارئین کے خطوط، شذرات ہوں یا مقالات، ان میں مخاطب ظاہر ہے قارئین ہوتے ہیں لیکن معارف کے پڑھنے والوں یا دوسرے الفاظ میں اس کے قدردانوں کی گفتگو کا کیا رنگ رہا، ان کا معیار کیا رہا اور اس معیار نے خود معارف کے معیار کو قائم اور باقی رکھنے میں کیا کردار ادا کیا؟ اس کا مطالعہ بجائے خود معارف شناسی یا معارف پروری کی راہ میں بڑا دلچسپ مقام ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی ادارت میں معارف قریب تیس سال، شہرت ومقبولیت بلکہ احترام وعقیدت کے مقام پر فائز رہا، اس عہد سلیمانی میں ان تمام موضوعات کی جلوہ سامانی نظر آتی ہے جن کا ذکر شروع میں کیا گیا، لیکن عجیب بات ہے کہ قارئین معارف کے خطوط کا کالم گویا کالعدم رہا، علامہ شبلی کے نام ان کے ہم عصروں کے مکاتیب ضرور شائع ہوئے لیکن ان کی حیثیت اور شناخت آثار و برکات کی رہی، خود سید صاحب یا مولانا عبدالسلام ندوی کے نام، معارف کے قدردانوں کے خطوط کا یہ اخفا اس وقت نا قابل فہم نہ رہا ہو لیکن آج اگر ذہن میں سوال اٹھتا ہے تو یہ نامناسب بہرحال نہیں۔ خود سید صاحب نے بھوپال یا پاکستان سے جو خط لکھے وہ بھی ان کی وفات کے بعد ۵۷ء میں شاہ معین الدین ندوی کے اس نوٹ کے بعد شائع کیے گئے کہ ''ان کے بہت سے خط محفوظ ہیں، ان کی

دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔

ترتیب وار اشاعت کی نوبت معلوم نہیں کب تک آئے، اس لیے شائقین کی خواہش پر مناسب معلوم ہوا کہ معارف میں ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع کر دیا جائے''، چنانچہ فروری ۷۵ء کے معارف سے ان کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا، ان خطوط میں نجی حالات کے ساتھ دارالمصنّفین اور معارف کی یاد اور فکر کا پہلو غالب ہے، مثلاً ''دارالمصنّفین کے متعلق'' اگرچہ مولوی مسعود علی حسن ظن رکھتے ہیں لیکن مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ عنقریب حیدرآباد اور بھوپال کی امدادیں بند ہو جائیں اور تجارت پر جو بندشیں ہیں ان سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوگا............خدا کرے میرے یہ اوہام غلط ہوں''۔

شاہ صاحب کو کلکتہ میں کسی عہدہ کی پیشکش ہوئی تھی، سید صاحب نے لکھا کہ ''آپ نے اپنے کلکتہ نہ جانے کا جو عزم ظاہر کیا اس سے دل بہت خوش ہوا، حقیقت یہ ہے کہ اس عمر میں جب قویٰ مضمحل ہو رہے ہوں خلف رشید کی طلب بہت بڑھ جاتی ہے، اب وہ کیفیت سمجھ میں آتی ہے جو مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین مرحوم کی دیکھی تھی کہ بعد کے کام کے لیے صحیح جانشین کا تصور ان پر بہت غالب تھا، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے ایثار کو قبول فرمائے اور آپ کی قناعت میں بیش از بیش برکت عنایت فرمائے''، ایک اور خط میں ہے کہ ''آپ حضرات اپنی جگہ جمے رہیے اور اب دارالمصنّفین کو بجائے ایک کے دو کی یادگار سمجھیے، نیا نظام قائم کیجیے''، ''دارالمصنّفین کی ہستی کو صرف میری ذات سے متعلق نہ سمجھیں، ہر انسان فانی ہے اس لیے اس کی نسبت فانی ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ آپ عزیزوں کی محنت سے اس کو بقا نصیب ہو''۔

یہ خطوط کیا ہیں، دارالمصنّفین اور معارف کے لیے سراپا درد اور تڑپ ہیں اور دارالمصنّفین و معارف کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے سب سے سچا اور حقیقی ماخذ بھی ہیں، یہاں موضوع کے تعلق سے صرف یہ بتانا ہے کہ ایک خط میں سید صاحب لکھتے ہیں ''میری میز کے خانہ میں مولانا شروانی اور بہت سے اکابر کے خطوط ہیں، ان کو جمع اور محفوظ کیجیے، شروانی صاحب کے خطوط کو نکلوا کر یکجا کر کے اگر مرتب کیا جا سکتا تو معلومات اور انشا پردازی کا اچھا خاصا مجموعہ ہوتا''۔

سید صاحب کے نزدیک ان خطوط کی اہمیت، معلومات اور انشا پردازی دونوں طرح سے تھی پھر انہوں نے خود ان خطوط کو معارف میں کیوں شائع نہیں کیا؟ اتفاق سے اس سوال کا جواب بھی ایک خط میں نظر آ گیا، لکھا کہ ''خطوط کی اشاعت میں اس کا خیال رہے کہ اس میں راز کی بات نہ ہو، خصوصاً

زندہ لوگوں کے خط نہ چھاپے جائیں"۔

یعنی سید صاحب کا اپنا خیال یہی تھا کہ زندہ لوگوں کے خط نہ چھاپے جائیں، اس خیال کو دیکھیے کہ سید صاحب نے اپنی رائے اور فکر کے مطابق ان خطوط کو شائع بھی نہ کیا جو صرف معارف کے قاری ہی نہیں تھے خود بھی مشاہیر کی صف میں نمایاں تھے، جیسے اکبر الٰہ آبادی، مہدی افادی، مولانا شروانی، علامہ اقبال اور عماد الملک حسین بلگرامی وغیرہ، ان سب کے خطوط معارف میں مکتوب نگاروں اور مکتوب الیہ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہی شائع ہوئے۔ اس میں استثناء مولانا محمد علی جوہر کا ہے جن کے خطوط ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئے لیکن یہ مکتوبات کم ہیں، شخصی اور اجتماعی احوال زیادہ ہیں، تاہم دارالمصنّفین اور معارف کے لیے مولانا جوہر کے تاثرات سے خالی نہیں، دیکھا جائے تو ان میں کچھ خطوط ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء کے ہیں اور یہ چھندواڑہ اور بیتول کی جیلوں سے لکھے گئے۔ اسی طرح پروفیسر تاثیر کا ایک نہایت عمدہ اور مفصل خط ہے جو ۳۴ء کا ہے لیکن چھپا یہ ۶۴ء میں ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی ان کے کئی خط آچکے تھے، یہ خط اس لائق ہے کہ اس کو یہاں پورا کا پورا نقل کیا جائے، کیوں کہ دوسرے مذکورہ بالا مکتوب نگاروں کے خطوط کا مجموعہ مشاہیر کے خطوط کے نام سے شائع ہو چکا ہے، ڈاکٹر تاثیر کا خط اب معارف کی فائلوں میں ہے، قریب نو صفحوں کا یہ خط بار بار پڑھنے اور لطف اٹھانے کے لائق ہے۔

مکتوب نگار کو بھی احساس ہے کہ خط بہت لمبا ہو گیا، یہی نہیں وہ ایک غیر دلچسپ وعظ کی صورت بھی اختیار کر گیا اور وعظ بھی کس کے سامنے؟ سید صاحب کے سامنے! کرمہائے تو مارا کرد گستاخ، اسی دلچسپی کی بنا پر یہ خط یہاں مکمل پیش کیا جاتا ہے۔

لنڈن۔ ۱۹؍ستمبر ۳۴ء

علامۂ محترم! السلام علیکم

خطوں کی رسید کا شکریہ۔ نو وارد تھا، تھوڑی بہت فرصت تھی، نجانے کیا کچھ کچھ لکھ ڈالا، اشاعت کے نام سے چونک اٹھا ہوں، دھندلی سی یاد ہے کہ پہلے خط میں نہایت نامستشرقانہ غیر سنجیدگی پائی جاتی تھی، (اور موضوع شاید "یبوست طلب" تھا) جیسے کوئی کھدائی کرنے والا صاف اجلے کپڑے پہنے کدال چلا رہا ہو! یا کوئی ڈنر کے لباس میں کان کنی کر رہا ہو! مجھے بیشتر مستشرق حضرات ماہر حفریات

ہی معلوم ہوتے ہیں، علامہ مرحوم کی تحریروں پر چند بزرگوں کو فقط یہی اعتراض تھا کہ "چٹخارہ پایا جاتا ہے" آپ ندوہ کے بیشتر ارکان میں یہی "نقص" ہے کہ آپ کی عبارت شگفتہ ہوتی ہے، بھلا وہ کیا عالمانہ تحریر ہوئی، جسے پڑھ کر انسان "عبوساً قمطریراً" نہ ہوجائے! اور میں نے تو یونہی ایک خط دھر گھسیٹا تھا، ہائے رے "تمنائے رنگ و بو" بغیر چننے" کے توڑا گیا"، ستمبر میں وہ خط چھپ چکا ہوگا، اس لیے لاعلاج معاملہ ہے، مگر دوسرا خط جو عمر خیام کے متعلق تھا اور جسے آپ میری "منشا کے مطابق" مع جواب چھاپ رہے ہیں، وہ ابھی بس کا روگ ہے، اس کے متعلق مجھے فقط اتنا اندیشہ ہے کہ کہیں اس سے یہ شائبہ نہ پیدا ہو کہ مجھے آپ کی گرانقدر تصنیف کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں، آپ کو نہیں، کیونکہ آپ ان باتوں سے بے نیاز ہیں اور محرم راز ہیں، خوب جانتے ہیں کہ اگر میں اس تصنیف کو بے حد اہم اور "تاریخی" نہ جانتا تو اتنی دور سے اتنی سی بات پر یوں ہاؤ ہو نہ کرتا، مگر بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی، صلہ تو کوئی کیا دے گا، صحیح داد دینے کے اہل بھی کم ہوتے ہیں، بیشتر حضرات محض ریویو دیکھنے ہی پر اکتفا فرمایا کرتے ہیں، اصل کتاب خریدنا تو درکنار مستعار لے کر پڑھنا بھی خلاف وضع سمجھتے ہیں، بعد میں ایک موہوم سا خیال رہ جاتا ہے کہ " کچھ متنازعہ فیہ امور تھے" اور بس! لہٰذا کسی نوٹ میں یا جہاں چاہیں، یہ بات واضح کردیں کہ میرے خیال میں "عمر خیام" انگریزی، اردو اور فارسی میں اپنے قسم کی ایک کتاب ہے اور جہاں تک تراجم سے مجھ پر واضح ہوا ہے، کسی اور زبان میں بھی اس موضوع پر ایسی جامع کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی، کیوں نہ ہو "شعر العجم" فارسی ادب پر لاثانی کتاب تھی، آخر یہ اسی آواز کی گونج ہے، براؤن زندہ ہوتے تو اسی طرح کی داد دیتے، یعنی ترجمہ کر ڈالتے، اب یہاں فارسی کے مشتاق کم ہورہے ہیں، صاحب ذوق تو پہلے بھی کم تھے، اب پھر ان مستشرق حضرات کو سیاسی پروپیگنڈے کا فکر ہر وقت دامنگیر رہتا ہے، بلنٹ نے عربوں کے لیے سب کچھ کیا، (کیا کچھ نہ کیا!) اور لارنس نے اس خواب کی تعبیر جس طرح کی وہ ہم دیکھ رہے ہیں، براؤن نے ایرانیوں کی "خدمت" کی اور جس طرح بلنٹ عربوں کی برتری کے لیے ترکوں کا دشمن بنا، براؤن ایرانیوں کے لیے عربوں کی تذلیل میں منہمک رہا، آج ترک عربوں کی غداری پر برافروختہ ہیں، عرب ترکوں سے "آزاد" ہوکر اپنے کیے کی سزا بھگت رہے ہیں اور ایرانی ایران پرستی کے گیت گا رہے ہیں۔

ان مستشرق باغبانوں کا ذکر چلتا تو "نشان برگ گل" تک بھی باقی نہ رہتا، مگر کارساز ما بفکر

کارما''، ہم ہندوستانیوں کا یہی سہارا رہ گیا ہے، دعائیں رہ گئی ہیں، مگر میں دعاؤں کا قائل ہوں، دنیا کے جملہ اسباب کارپردازی سے زیادہ موثر سمجھتا ہوں لیکن ستم یہ ہے کہ عام دنیائے اسلام ہم دعا گوؤں کی نیازمندی تک کی منکر ہے اور اس کے بہت حد تک ہم خود ہی ذمہ دار ہیں، اگر ایرانی ہماری فارسی درزی سے ناواقف ہیں یا عرب ہمارے کام سے ناآشنا ہیں تو یہ ہمارا اپنا قصور ہے، غضب خدا کا ہم ہزاروں روپئے برباد کر کے عربی اور فارسی کی ڈگریاں انگلستان سے آکر تولے سکیں گے مگر ایران اور مصر کی طرف منہ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں، انگریز ہنستے نہ ہوں گے جب وہ ہمیں مصر و ایران کے بجائے انگلستان میں عربی فارسی سیکھنے کے لیے آتا دیکھتے ہیں، مجھے اس کا جواب معلوم ہے کہ تعلیمی منڈی میں مانگ یورپ کی ڈگری کی ہے، اول تو علم کو دوکان سازی کا ذریعہ بنانا ہی مکروہ ہے اور پھر اب جب تمام تعلیمی محکمے ہندوستانی وزرا کے ہاتھوں میں ہیں، یہ عذر بھی خوئے بدرا بہانۂ بسیار کا مصداق ہے، برطانوی ہند تو گیا کان نمک میں، نہ جانے حیدرآباد کی ریاست کو کیا ہو گیا ہے کہ اسلامی علوم کے حصول کے لیے طلبہ کو یورپ وظائف دے کر بھیجا جاتا ہے اور جب تک ولایتی ڈگری نہ ہو اعلیٰ گریڈ کی اسامی ملنی محال ہے، ہمارے روزناموں کی مقالاتی بولی میں وقت آگیا ہے کہ ''ارباب حل وعقد'' کی توجہ اس بے ہودگی کی طرف مبذول کرائی جائے، یہ آپ کا اور آپ کے ادارے کا ''اولین فرض'' ہونا چاہیے، ہمارے نوجوان مستشرقوں کو اگر ایرانی اور مصری بولنی لکھنی آتی تو اسلامی ممالک اور ہندی مسلمانوں کے درمیان اتنی مغایرت کبھی پیدا نہ ہو سکتی، لکچروں، مقالوں، اداراتی سیاحتوں سے کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا، آہستہ آہستہ قطرہ طوفان بن جاتا ہے اور یہ کوئی لاکھ دو لاکھ کی اسکیم نہیں، موجودہ ذرائع اور اسباب کے صحیح استعمال سے سب کچھ ہو سکتا ہے، پہلے حیدرآباد، علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور، اسلامیہ کالج پشاور، پھر ڈھاکہ یونیورسٹی اور اس کے بعد ملک کے جملہ تعلیمی ادارات کی خدمت میں التماسات کیے جا سکتے ہیں، آپ گشتی مراسلات، زبانی معروضات اور ''اداریات'' کو جنبش میں لائیں، انجمن حمایت اسلام کی بدلی ہو رہی ہے، انہیں لکھیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد والے ہاتھ پاؤں ماریں، کچھ نہ کچھ تو ہو رہے گا۔

وہ دینی تعلیم والی اسکیم ''محض کاغذ پر نہیں رہ گئی''، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب (ان چند لوگوں میں سے ہیں جو علم وعمل دونوں سے متصف ہیں اور مغربی علوم کے ساتھ اسلامی علوم میں بھی شغف رکھتے ہیں) میں نے لکھا ہے کہ وہ کالج کھلنے پر مجلس منتظمہ کے سامنے کاغذات رکھ دیں گے،

ایک آدھ مزید معلم کی منظوری بھی لے چکے ہیں، علامہ اقبال اسی موضوع پر انجمن کے ارکان اور اخبارات میں ایک گشتی مراسلہ شائع کر چکے ہیں، لہٰذا مجھے اپنی گزارشات کے مسموع ہونے سے ناامیدی نہیں، عنقریب آپ کو اطلاع پہنچے گی، میں نے ایک اور اسکیم کے متعلق بھی لکھا ہے اور وہ ہے بھی کم خرچ، اردو لائبریری کا قیام، اس اسکیم کو حسب استطاعت پھیلایا جاسکتا ہے، میں نقطہ یہ چاہتا ہوں کہ آکسفورڈ، کیمبرج، برٹش میوزیم اور ڈبلن کی طرح مسلم یونیورسٹی، اسلامیہ کالج لاہور، عثمانیہ یونیورسٹی وغیرہ کو قانوناً کاپی رائٹ لائبریری قرار دیا جائے اور ملک میں جو کتاب یا رسالہ اردو میں شائع ہو وہ وہاں قانوناً پہنچے، اس سے ہمارا ادب مستقبل کے لیے محفوظ ہوجائے گا اور آئندہ نسلیں ہمارا نام لعنتوں سے یاد نہیں کریں گی، خرچ بھی زیادہ نہیں اور طرز عمل بھی انوکھا نہیں کہ اس کی مخالفت کی جائے، عام متمدن ملکوں میں یہ طریق رائج ہے، ہندی سنسکرت والے بھی اسی طرح اپنا تحفظ کر سکتے ہیں یا کسی اور طرح جس ادارے کو توفیق ہو وہ تھوڑے سے خرچ پر پچھلی صدی کی کتب کو حاصل کر کے محفوظ کرسکتا ہے، ابھی یہ پھیلاؤ اتنا نہیں بڑھا کہ سمیٹا نہ جاسکے۔ چند سالوں تک یہ آسان کام محال نظر آئے گا، اسمبلی کا چناؤ ہونے والا ہے، اگر اس وقت سب امیدواروں سے وعدے لیے جائیں تو شاید چند ایک کو یاد رہ جائیں اور اس میں نہ حکومت نہ برادران وطن کا نقصان ہے، اس لیے بظاہر اس کا پورا ہونا مشکل نہیں اور یوں رموز مملکت کی عمیق مصلحتیں جو چاہیں کر دیں۔

میں نے چند سطریں لکھنے کی نیت کی تھی، لیکن کچھ ایسی تجویز اور گتھیاں پڑ گئی ہیں کہ ان کے سلجھانے میں الجھ گیا ہوں، آپ بھی جھنجھلا رہے ہوں گے کہ ایک کی تین اسکیمیں بناڈالیں، تثلیث کا ملک جو ہوا، لیکن اور کہوں کس سے؟ اور کہوں تو سنتا کون ہے؟ آپ ہیں، علامہ اقبال ہیں اور لاہور کے چند احباب! البتہ آپ آواز بلند کریں تو بہت سے سننے والے اور لبیک کہنے والے پیدا ہوجائیں گے، کیجیے!

آپ کی ''ہندوستانی'' والی تجویز سے مجھے اتفاق ہے جن لوگوں نے گذشتہ مردم شماری پر غور کیا ہے وہ اس نکتہ تک پہنچ جائیں گے، لہٰذا اب سے میں اسی لفظ کو استعمال کروں گا، الا آنکہ تکلموا الناس علی قدر عقولھم کا مضمون ہو۔

معارف کے پرچوں کا شکریہ، سفر افغانستان کا حال دلچسپی سے پڑھا، بالخصوص گویا صاحب

اور ہادی صاحب کی بحث، گویا صاحب سے کہیے اس مضمون پر مستقل مضمون لکھیں، پُرلطف ہوگا، پرویز صاحب کے مضمون کی دو قسطیں غور سے پڑھیں، نہایت پتے کی باتیں کہی ہیں لیکن کیا ہندوستان میں لامذہبی کی وبا مغرب کے تتبع ہی کا نتیجہ ہے؟ کیا مغرب واقعی لامذہب ہے؟ کیا یہ ''مادیت'' اسلامی ممالک میں بہت پہلے سے رائج نہیں؟ جن لوگوں کو خواہ مخواہ ''شاہان اسلام'' کہا جاتا ہے، انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا، جو ہم غیر ممالک سے مثالیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، علامہ مرحوم نے کس قدر صحیح لکھا تھا کہ کشورستانی کی حوصلہ مندیوں کا نام جہاد رکھ لیا جاتا ہے اور ذاتی رنجشیں مذہبی اختلافات اور نزاع بن جاتی ہیں، شخصی حکومتوں کا پست اخلاق ضرب المثل ہے، اس میں مشرق و مغرب کا امتیاز بے معنی ہے، ہمارے ''روشن خیال'' نوجوانوں کو مغربی شہروں کی عیاشیوں کے قصے سنانا لاحاصل ہے، اگر ہالی ووڈ کے ایک ہفتہ کا خرچ ''رنگیلے پیا'' کے نوابوں سے زیادہ ہے تو یہ دونوں میں سے کسی کی ذہنی حالت کی برتری کا ثبوت نہیں اور امرا کی قلبی بے اطمینانی کوئی نیا مرض نہیں، ع کلاہ دلکش است اما بہ درد سرنمی ارزد، کے ساتھ ع چہ خورد بامداد فرزندم کا پیوند ہمیشہ سے چلا آرہا ہے، ہمارے روشن خیال ''اخلاقیین''، یقیناً ان خوفناک حالات پر ہماری ہی طرح متاسف ہیں، ہمارا ان کا اختلاف فقط اتنا ہے کہ ہم افلا یعقلون کو سند قرار دیتے ہوئے ''صداقت'' مطلق کے قائل ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ مذہب کی ترویج نے ہر ملک میں ''بے بصیرتی'' پھیلائی جس کا نتیجہ ہر قوم کو یکساں طور پر درپیش آیا، اگر مذہبی عقائد کی بنیاد ایمان بالغیب نہ ہوتی، اگر ''سوسائٹی کے قوانین'' کی طرح ان کی پشت پر تجربہ و تعقل ہوتے تو حالات کے بدلنے پر وہ بیکار نہ ہوجاتے، جن کتابوں سے مغرب کا اخلاقی انحطاط ثابت کیا گیا ہے، ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے بیدار مغز مفکر بری عادتوں کو راسخ ہونے سے روکتے رہتے ہیں، جس طرح مذہبی مجتہد، مذہبی قوانین کو مسخ ہونے سے بچاتے ہیں، اخلاقی مفکر عقلی قوانین کو زندہ کرتے رہتے ہیں، یعنی یہ ''عقلی'' بزرگ صداقتِ اضافی کے قائل ہیں، آخر مذہب کا نام لینے والی اقوام کے اخلاقی زوال اور لامذہب گروہوں کی پستی میں کیا فرق ہے؟ ان سوالات کا جواب سیاسی اصولوں کی بحث سے دیا جانا چاہیے، الزامی جواب بیکار محض ہیں، یہ کہنا کہ عیسائیت کے ''مخصوص معتقدات کارزارِ حیات میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتے، اس لیے وہ نفس مذہب سے بیزار

ہو گئے''، اس لیے بھی غلط ہے کہ یورپ نے عیسائیت پر کبھی عمل ہی نہیں کیا، یورپ کے اخلاقی زوال کی مثالی زنا کاری، قمار بازی اور شراب خوری کی کثرت سے دی گئی ہے، ''عمر خیام'' میں آپ ہی لکھتے ہیں کہ شراب خوری پانچویں صدی ہجری میں اسلامی ممالک میں عام تھی اور آج لامذہب، روس میں یہ تمام بدعادتیں یورپ کے اور ممالک کے مقابلہ میں بہت کم ہیں، آخر کیوں؟ اور پھر یہ کیسے ثابت ہوا کہ یہ بدکار لوگ لامذہب ہیں اور یہی لامذہبی کی محرک ہو رہی ہے، میں نے جہاں تک تحقیق کی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یورپ نے مذہب کو ہرگز نہیں تیاگا، کیمبرج اور لندن اور دیگر حصص کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں سے مل کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اکثریت لامذہب نہیں، کچھ عرصہ ہوا کہ لورپول کے بشپ نے موحد عیسائیوں کے ایک مشہور واعظ (Prof. L. P. Jacks) کو اپنے گرجے میں لیکچر دینے کے لیے بلایا، جیسے بریلوی حنفیوں کی مسجد میں دیوبندی حنفی آ گھسے، بس پھر کیا تھا، قیامت برپا ہوگئی، لارڈ سیسل جیسے اکابر لال پیلے ہو گئے، اثنا عشری بشپوں کی کونسل بیٹھی اور لورپول کے لاٹ پادری نے جب تک توبہ کا اعلان نہ کیا، مخلصی نہ ہوئی، یہ تمام مصیبت بدمذہبی کی ہے اور ع ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند، یہاں کے گرجے ہماری مسجدوں سے زیادہ بے آباد نہیں اور مسجدوں میں جس طرح مذہب پیش کیا جاتا ہے اس کے متعلق پرویز صاحب کے مضمون کے پہلے فقرے صحیح طور پر منطبق ہو سکتے ہیں لیکن فرق اتنا ہے کہ یورپ نے بدمذہبی کے باوجود دنیوی ترقی حاصل کر لی ہے ہم کو یہ بھی نصیب نہیں۔

میرا مطلب محض یہ ہے کہ یورپ کے عیوب گن گن کر دل بہلانا لاحاصل ہے، ہمارے اپنے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے، دوسروں کی شعلہ سامانی پر خندہ زنی کا کیا فائدہ؟ اس سے خواہ مخواہ نفس کو خود فریبی کا موقع ملتا ہے۔

صحیح دینی تدریس کی اسکیم کی طرف توجہ دلانے سے میرا مقصد یہی تھا، لامذہب صحیح مذہب کی طرف آ سکتا ہے، بدمذہب کی اصلاح بہت مشکل ہے، میرے ایک موحد دوست ابھی ابھی روس سے آئے ہیں، کہنے لگے روس کے لوگ نادانستہ طور پر خدا کے احکام کی پیروی کر رہے ہیں، یاد ش بخیر! علامہ اقبال کہا کرتے تھے کہ روسی ''اسلام کے قریب آ رہے ہیں'' اور ہم! آج نہیں صدیوں سے بگڑ رہے ہیں:

گر مسلمانی ہمین است کہ حافظؔ دارد وائے گر در پس امروز بود فردائے

یورپ کو یہ سمجھانا کس قدر مشکل ہے کہ وہ اسلام کا اندازہ ہم سے نہ لگائے اور یہ کہ ہماری بدعملی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہمارا مذہب ناممکن العمل، پادری کہتے ہیں کہ ما جوابکم فھو جوابنا۔

ہم تو خیر ہم ہوئے، ہمارے مبلغ ہم سے بہت آگے پہنچے ہوئے ہیں، یہاں ایک صاحب ہیں جو روحیں بلانے والی انجمن کے سرگرم کارکن ہیں، ان کے ایک مرید مولوی رومؒ سے باتیں کرنے کے مدعی ہیں اور جب کبھی وہ کسی چلتی پھرتی ''نومسلمہ'' کی تصویر شائع کردیتے ہیں تو ہندوستان میں دھوم مچ جاتی ہے اور جو کوئی سفید چمڑی کا بے ملک نواب اعلانِ اسلام کردے تو سیکڑوں روپے جلوسوں پر برباد ہوجاتے ہیں، غلامانہ ذہنیت کی بھی حد ہونی چاہیے۔

یہی وہ بد مذہبی ہے جس سے بیزار ہوکر کئی خوش نیت ''اخلاقیین'' کی زبانیں بدلگام ہوجاتی ہیں اور جو بچارے منہ سے کچھ نہیں کہتے وہ ہٹلر اور مسولینی کے اصلاحی پروگرام پر عمل درآمد کرنا چاہتے ہیں، اسلام سے ہر دو گروہ دور ہو جارہے ہیں ع پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا، عجب نہیں کہ کوئی سیاسی چالباز ہٹلر کا بہروپ بھر کر نمودار ہوجائے اور اسلام کے نام پر ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھ دے، پنجاب کی زمین ایسی تخم ریزی کے لیے عموماً طیار ہوتی ہے۔

میری باتوں میں کچھ تلخی کچھ زہرخند کی سی کیفیت پائی جاتی ہے لیکن میں ''قنوطی'' نہیں، میں جانتا ہوں کہ مخلص کام کرنے والے لوگ بھی موجود ہیں، مثلاً آپ کا ادارہ تنہا وہ کام کررہا ہے جو سلطنتوں کو کرنا چاہیے۔ اور جا بجا اکے دکے کارکن موجود ہیں۔

اسی سال لنڈن سے ایک فاضل ہندوستانی بھائی نے انگریزی میں ایک کتاب برنڈ شا کی کتاب کے جواب میں شائع کی ہے اور لنڈن کے غریب مسلمانوں کی ایک جماعت مرتب کی ہے، جو عملی زندگی سے اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں، یہ کتاب اردو میں ترجمہ ہونے کے قابل ہے، کئی انصاف پسند انگریزوں نے بھی اس کی تعریف کی ہے، B.B.C ریڈیو کے ایک لیکچر میں بھی اس کا تذکرہ ہوا تھا، پرویز صاحب شگفتہ قلم ہیں، اگر اسے اردو میں لے آئیں تو کار ثواب ہوگا، مصنف کا نام T. A. Kazi ہے، انگلستان ہی میں سکونت ہے، فلسفہ سے خوب واقف ہیں اور مشرق و مغرب کے

رمز آشنا ہیں۔

یہ خط بہت لمبا ہو گیا ہے اور ایک غیر دلچسپ وعظ کی صورت پکڑتا جارہا ہے اور وعظ بھی پھر آپ کے سامنے! کرمہائے تو مارا کرد گستاخ۔

کہیے سلطان سلیم کا فارسی دیوان مطبوعہ استنبول حاصل کر کے بھیجوں؟ کمیاب ہے لیکن شاید آپ کے پاس ہو، چند جزو ہیں، چھ شلنگ میں ملے۔

ٹائمز میں پچھلے دنوں عمر خیام کے متعلق ایک طویل سلسلۂ خط و کتابت جاری رہا ہے، تراشے میرے پاس موجود ہیں، سر ڈینی سن راس کا خط سب سے زیادہ پُر مغز تھا، میں عنقریب ان سے مل رہا ہوں، آپ کی کتاب کا ذکر کروں گا، سنا ہے فارسی شستہ بولتے ہیں اور خوب آدمی ہیں، نہ جانے اردو جانتے ہیں یا نہیں، شعر العجم کی وجہ سے کئی مستشرق اردو سیکھنے کے مشتاق ہو گئے تھے، عمر خیام اس شوق کو اور تیز کرے گا، پہلے تو یہی کہتے تھے کہ اردو سیکھیں تو کیوں اس میں کون سی ایسی کتاب ہے جو کسی موضوع پر معلومات میں اضافہ کر سکتی ہے؟

ٹائمز ہندوستان آتا ہے اس لیے تراشے بھیجنا بے کار ہوگا اور ان میں کوئی ایسی بات بھی نہیں، زیادہ تر جہالت نمائی ہی ہے اور لوگ ہیں کہ چلے آرہے ہیں، فارسی عربی سیکھنے انگلستان میں۔

رات زیادہ ہو گئی ہے، دن برٹش میوزیم میں گزر جاتا ہے، گرمی کی چھٹیوں کا بیشتر حصہ وہیں بسر کیا ہے، خط و کتابت رات ہی کو ہو سکتی ہے۔

شب بخیر نیاز مند

(ڈاکٹر دین محمد تاثیر)

آمدم بر سر مطلب، کہ سید صاحب کے زمانہ میں قارئین معارف کے خطوط کی اشاعت کا اہتمام نہیں تھا، شاہ معین الدین ندوی نے سید صاحب کی تقلید میں خطوط شائع کیے لیکن آثار علمیہ و ادبیہ ہونے کے بعد، انہوں نے کچھ اور خط شائع کیے جیسے سید اختر امام کا ایک خط جو ماسکو سے لکھا گیا تھا اور ڈاکٹر صابر خاں کا جو امریکہ سے آیا۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے زمانہ میں تازہ خطوط کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا لیکن یہ

بھی محدود رہا، لیکن یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں ڈاکٹر حمید اللہ کے متعدد اور بہت اہم خطوط تھے، ڈاکٹر صاحب کے کچھ خطوط شاہ صاحب کے زمانہ میں بھی شائع ہوئے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا دور آیا تو معارف میں پہلی بار پابندی سے خطوط کی اشاعت نظر آئی، مولانا نے تو ایک مستقل باب ''معارف کی ڈاک'' کے عنوان سے قائم کردیا، اس طرح قارئین کے مشوروں، ارادوں اور معارف اور دارالمصنّفین سے تعلق کے اظہار کو ایک نئی راہ ملی۔

تعلق کا معاملہ پہلے بھی تھا، شاہ معین الدین ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا انتقال ہوا تو معلوم ہوا کہ ایک دنیا ہے جو دارالمصنّفین اور معارف کے گرد گردش کرتی رہی ہے، بے شمار تعزیت نامے جن میں صرف اظہار رنج و غم ہی نہیں تھا، دارالمصنّفین اور معارف کے لیے دلاسہ بھی تھا اور تعلقات کی توسیع و تجدید بھی تھی، یہ تعزیت نامے صرف ان دونوں بزرگوں اور بعد میں مولانا ضیاء الدین کی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ماٰخذ کی حیثیت بھی رکھتے ہیں، مثلاً ڈھاکہ کے شعیب عظیم کا ایک خط ۸۸ء میں چھپا، صباح الدین صاحب کی تعزیت کا، اس میں مکتوب نگار نے ۶۳ یا ۶۴ میں ڈھاکہ میں علامہ شبلی پر ہونے والے سیمینار کا ذکر کیا، صباح الدین صاحب اس میں مدعو نہیں تھے، یہ اتفاق تھا کہ وہ اپنے نجی کام سے ڈھاکہ گئے، کسی نے سیمینار والوں کو اطلاع دی، لوگ پہنچے اور بقول مکتوب نگار صباح الدین صاحب بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور بے چوں و چرا صدارت قبول کرلی، مکتوب نگار کے خیال میں ڈھاکہ میں پھر ایسا کامیاب سیمینار مولانا شبلی پر نہیں ہوا۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی جدت سے خطوط کی اشاعت کے سلسلہ نے قارئین میں دلچسپی کی نئی شکل پیش کردی اور اب یہ باب ان ابواب میں سے ہے جن پر نگاہِ شوق پہلے پڑا چاہتی ہے۔

معارف کے ان خطوط کی تدوین کی خواہش ہونی چاہیے، جب مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی شائع ہوئی تو مولانا ضیاء الدین صاحب نے لکھا کہ اندازہ ہے کہ خطوط کی ابھی دو جلدیں اور ہوں گی یعنی مشاہیر کے خطوط کی، اس کے بعد علما و فضلا اور ادیبوں کے خطوط کی جلدیں ہوں گی، یقیناً یہ سلسلہ آگے بڑھے گا، علامہ شبلی کے بارے میں کہا گیا کہ وہ علم کا ایسا پتلا تھے جس کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہیں، معارف ایسا رسالہ ہے جس کی ایک سطر بھی بے کار نہیں۔

معارف کی ڈاک

مکتوب جلال پور

زاہد جعفری
جعفری باغ، جلال پور۔(یو۔پی)

محترمی! سلام مسنون

خاکسار کی دو تحریریں معارف میں بڑے اہتمام سے آپ نے شائع کیں، ذرہ نوازی کا شکریہ۔

میرے جوان فرزند کی رحلت نے دماغ کو جو صدمہ پہنچایا اس نے روح مجروح کر دی۔ ویسے پہلے ہی سے درویشانہ گوشہ نشینی طبعاً پسند تھی، البتہ قلم کی روانی ساٹھ سال سے کبھی نہیں رکی۔ دماغ میں جدیدیت و جمالیاتی تغزل کی قوس وقزح رنگ بھرتی رہی۔ ذوق مطالعہ نے شب بیداری کی ایسی عادت ڈالی کہ کچھ نہ پوچھیے۔ لیلائے نثر وز لیخائے نظم نے آشفتہ مزاجی کو زنجیروں میں پابند کر کے عجیب ناگفتنی لذت سے آشنا کر دیا مگر شہرت کی آسمانی وسعتیں نہیں چاہتا۔ ادھر صدمۂ جانکاہ نے ذرا سا رخ موڑا تو کچھ احساسات وجود میں آ گئے۔ کاش آپ کی بلیغ نگاہی اور معارف کی تحقیقی میزان پر تل جائے! مہمیز حوصلہ نہ آپ کرتے تو میں سمع خراشی بھی ہرگز نہ کرتا۔ کاش............

اور حضور والا!".........مرزا دبیر کا آخری کلام.........کی بے حد پذیرائی کی گئی۔ خصوصاً میرے کرم فرما ڈاکٹر فخر عالم کا خط تو میرے لیے دستاویز بن گیا۔ اس کی نقل ارسال کر رہا ہوں، مکتوبات میں ملفوظ و محفوظ ہو جاتا تو اس ہیچ مداں کا شبابِ ضعیفی مائل بہ رجعت نو ہو جاتا!

آگے حد ادب.........۔ نیاز مند

زاہد جعفری

محب من! سلام و نیاز

مرا بس است کہ بینم ترا بچشم خیال برو بباش پس پردۂ خفا بینم

لاریب اس بحر عمیق کی غواصی کا یارا کسی فارس میدانِ تہور کو ہی ہو سکتا ہے۔ یہ دقت پسندی،

دقیقہ شناسی اور ایسی نکتہ رسی کسی زاہد مرتاض سے ہی متوقع ہوسکتی ہے۔تن آسان ماہرین عروض وجمل سے ایسے ایسے گوہر آبدار و در ہائے شہوار کی دریافت و بازیافت زنہار ممکن نہیں۔ایسی معجز نما، ہوش ربا، چشم کشا اور بصارت افزا تحریر کسی کہنہ مشق اتالیق نستعلیق رقم کسے خامۂ اعجاز رقم ہی سے معرض وجود میں آسکتی ہے

نہ ہر مغزے کہ بوید نکہت از مصر و یمن گیرد مشام تیز باید تا نصیب از پیرہن گیرد

من اے دریائے بے پایاں بموج تو دُر افتادم نہ گوہر آرزو دارم نمی جویم کرانے را

آپ کا اپنا ڈاکٹر فخر عالم

نصیر پور، اعظم گڑھ

مکتوب علی گڑھ

۱۸؍جمادی الآخر ۱۴۴۱ھ

مطابق ۱۳؍فروری ۲۰۲۰ء

محترم مدیر معارف! سلام مسنون

ہمارے دیرینہ کرم فرما اور عزیز مکرم ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۵؍جنوری ۲۰۲۰ء (معارف فروری ۲۰۲۰ء، ۱۴۷۔۱۴۸) میں انتہائی تیز قلمی سے خاکسار راقم کے مقالہ کی قسط اول ہی پر استدراک لکھ بھیجا اور خاکسار کو محنت شاقہ کی زحمت اٹھانے پر اپنے دلی درد و کرب کا اظہار کیا ہے جس کے لیے خاکسار راقم شکر گزار ہے۔آں عزیز کی خدمت میں چند معروضات پیش ہیں کہ ان پر وہ اور دوسرے مبصرین کرام غور فرمائیں اور ہم محققین زحمت کش کی رہنمائی کریں۔

عزیز مکرم نے اس اصل نکتہ تحقیق و ترقیم پر غور نہیں فرمایا کہ خاکسار کا مقصد حافظ و مغلطائی کی گمشدہ/ مدفون کتاب سیرت ''الزہر الباسم فی سیر ابی القاسم'' کا تعارف و تبصرہ پیش کرنا ہے تاکہ طالبین علم و تحقیق کو بتائے کہ اس کی قدر و قیمت اور افادیت کیا ہے۔

بارہ سال قبل چھپنے والی کتاب/ مطبوعہ کا علم خاکسار کو نہ تھا اور نہ ہی مفتی محمد سعید خاں کو اور نہ ان کے مرتب و محقق کو۔اس کے علم اور دستیاب ہونے کی صورت میں بھی کسی نہ کسی کو زحمت تعارف و

تبصرہ اٹھانی ہی پڑتی۔

ڈاکٹر خمیس بن صالح الغامدی کی محققہ طباعت الزہر الباسم کی تفصیلی اطلاع سے ہم تمام سیرت نگاروں اور قاریوں کو آگاہی ہوئی جس کے لیے سب ہی ان کے ممنون ہیں۔

ڈاکٹر قاسمی کو اس طباعت اولین کا علم تھا تو اس سے انہوں نے نہ صاحبان علم و تحقیق کو بروقت باخبر کیا، نہ خاکسار پر کرم کیا، حالانکہ وہ خاکسار کے قدیم کرم فرما ہیں۔ وہ اگر اس کا تعارف و تبصرہ لکھ دیتے تو ہم سب ناواقف طباعت زحمت کشی سے بچ جاتے۔

خاکسار راقم نے اپنے مقدمہ/ دیباچہ میں بھی یہ اظہار کیا تھا کہ ایک عرصہ سے انتظار رہا کہ مفتی محمد سعید خاں یا ان کے محقق و مرتب اس پر ایک تعارفی مقالہ/مضمون لکھیں گے کہ اسے کوئی مطبوعہ اور مخطوطہ دستیاب نہ تھا۔

مفتی محمد سعید خاں کی عنایت خسروانہ سے خاکسار کو ان کے ادارہ کی مرتبہ و مطبوعہ دو جلدوں کا بہت حسین و جمیل فوٹو اسٹیٹ کتابی شکل میں ملا اور اس کے تعارف و تبصرہ اور تحقیق و تنقید پر دو طویل مقالے تابڑ توڑ تیز قلمی سے لکھنے کی توفیق الٰہی ملی اور مختصر مقالہ کی اشاعت کا سہرا معارف اور اس کے مدیران کرام کے سر بندھا اور خاکسار کے سر واقف و آگاہ محققین و مرتبین کی سہل نگاری سے اولیت کا۔

مکتوب نگار کو بڑا املال ہے کہ ''ڈاکٹر خمیس اور مولانا احسن عبدالشکور کی تحقیق و تعلیق کا موازنہ کرنے کے بعد اپنی فاضلانہ رائے ظاہر کرتے''۔ بس اتنی عرض ہے کہ دونوں طباعتوں/تحقیقوں کا مقصد خاکسار تھا اور نہ ہی تحقیق و تعلیق احسن عبدالشکور کا، خاکسار کو حافظ مغلطائی کی کتاب کی افادیت دکھانی مقصود تھی، سو دکھادی۔

اب مکتوب نگار محترم سے درخواست ہے کہ ان کو ان دونوں تحقیقات کا علم ہے، لہٰذا وہ ''موازنہ خمیس و احسن عبدالشکور'' لکھ کر اہل تحقیق کی رہنمائی کریں۔

آخری عرض یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہی طباعت، تحقیق و تعلیق سے کار اہل علم و تحقیق چل جاتا تو کتب سیرت و حدیث و تفسیر وغیرہ تمام علوم اسلامی اور فنون علمی کی متعدد بلکہ بہت سی تحقیقات اور طباعتیں وجود میں نہ آتیں، اس کا غالباً ان کو علم ہے۔

والسلام مع الاکرام

محمد یٰسین مظہر صدیقی

باب التقریظ والانتقاد

پاکستان سے چند جدید علمی مطبوعات ـ ۷

ڈاکٹر عارف نوشاہی

پشتو زبان کے مصنّفین اور شعرا کی فرہنگ: عرصہ گیارہ سال بعد، ۲۰ تا ۲۲ دسمبر ۲۰۱۹ء صوبہ بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ جانے کا اتفاق ہوا۔ سفر کا اصل مقصد تو خانۂ فرہنگ ایران، کوئٹہ میں منعقد ہونے والی ایک ادبی نشست بیادِ ڈاکٹر انعام الحق کوثر (۱۹۳۱ـ۲۰۱۴ء) میں شرکت تھا۔ ڈاکٹر کوثر کی فارسی ادب کے لیے بہت خدمات ہیں اور اس سلسلے میں ان کی کتاب شعر فارسی در بلوچستان (اسلام آباد، ۱۹۷۵ء) اپنے موضوع پر حوالے کا درجہ رکھتی ہے۔ اس ادبی نشست کے حاشیے میں دو پرانے دوستوں سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ قاری احسان اللہ صاحب کتاب دوست، کتاب شناس اور کتاب فروش ہیں۔ کانسی روڈ پر ان کا مکتبہ الغزالی اور ساتھ ہی واقع گھر، قدیم اور نایاب مطبوعات اور نادر مخطوطات کا مرکز ہے۔ ان کے ہاں ایران، افغانستان اور عرب ممالک کی چھپی ہوئی حوالے کی کتب دستیاب ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرؤف رفیقی کا مکان بھی کانسی روڈ پر واقع ہے انھوں نے اپنے مکان پر ایک بڑا کتب خانہ اور رفیقی تحقیقاتی مرکز قائم کیا ہے جہاں سو کے قریب عربی، فارسی، پشتو مخطوطات کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں مطبوعہ کتب اور جرائد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تخصص پشتو زبان و ادب ہے اور اس سلسلے میں اب تک ان کی تقریباً چالیس کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تصانیف میں ایک شکرستان روہ (کوئٹہ، ۲۰۱۰ء) ہے جو ایسے پشتونوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے فارسی میں شاعری کی۔ اس سفر میں انھوں نے دس جلدوں پر مشتمل ایک خاص کتاب مجھے تحفتہً دی۔ اسی کا ذکر یہاں مقصود ہے:

ویاڑلی: د پشتو لیکوالو، شاعرانو او نور و پشتو پېژندونکیو لیکوالو د پېژندنې لارشود، مشترکہ اشاعت: د افغانستان ملی تحریک، کابل و ڈاکٹر رفیقی تحقیقی مرکز، کوئٹہ، ۲۰۱۷ء، ۴۶۲۸ صفحات، ۱۰ جلدیں۔

☆ ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

ویاڑلی پشتو زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے مفاخر۔ کتاب کا ذیلی عنوان بھی پشتو میں ہے۔ اصل اور ذیلی عنوانات کا مفہوم یوں بنتا ہے:

مفاخر: پشتو مصنّفین وشعرا اور دیگر پشتو شناسوں کے احوال وآثار سے متعلق راہ نما

فاضل مصنف نے زمان ومکان کی کوئی قید نہیں رکھی، ہر زمانے اور ہر مقام کے رجال اس میں شامل ہیں۔ فطری طور پر غالب تعداد پاکستان اور افغانستان کے لکھنے والوں اور شاعروں کی ہے۔ کتاب کو تخلص وار، الف بائی ترتیب پر مرتب کیا گیا ہے اور ہر جلد پر متعلقہ حروف کی وضاحت موجود ہے۔ فاضل مصنف نے اس میں ان غیر پشتو زبان لوگوں کو بھی شامل کیا ہے جنھوں نے کسی دوسری زبان میں پشتو سے متعلق کوئی تحریر یادگار چھوڑی ہے۔ مثال کے طور پر جلد ششم میں ''عرشی، امتیاز علی'' کو بھی اس معجم میں شامل کیا گیا ہے اور اُن کی کتاب اردو میں پشتو کا حصہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی رضا رامپور لائبریری کے کتاب دار تھے۔ کسی بھی اندراج کا انحصار مصنف کو دستیاب معلومات پر ہے۔ تاہم ایک مکمل اندراج میں کسی مصنف یا شاعر کی تاریخ ومقام ولادت ووفات، مختصر حالات زندگی، فہرست تصانیف اور فہرست مآخذ شامل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے ایک اور اہتمام بھی کیا ہے جسے دیکھ کر زرکلی کی الاعلام اور کحالہ کی معجم المولفین کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ یہ اہتمام بعض افراد کی تصویر، ان کی تحریر کے نمونے اور ان کی مطبوعہ تصانیف کے سرورق کے نمونوں کی اشاعت ہے۔ اہم ترین افغان یا پشتو زبان وادب سے متعلق شخصیات کے اندراجات صرف ان کی ذاتی زندگی کی معلومات اور فہرست تصانیف تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کے بارے میں جو کتابیں اور مقالات لکھے گئے ہیں ان کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔ میں یہاں دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ جلد اول میں ''افغانی، جمال الدین سید'' اندراج چھیاسٹھ صفحات پر مشتمل ہے (صفحہ ۳۶۷ تا ۴۳۳)۔ اس اندراج میں افغانی کی اپنی تصانیف کے علاوہ ان پر دنیا بھر میں شائع ہونے والے ہر زبان کے لٹریچر کی فہرست دی گئی ہے۔ یہی کیفیت جلد سوم میں ''خوشحال خان خٹک'' اندراج کی ہے جو تریسٹھ صفحات (صفحہ ۱۴۱۰ تا ۱۴۷۲) پر مشتمل ہے۔ کتاب کی جلد دہم خاص جلد ہے۔ اس میں مستشرقین، غیر ملکی محققین کا اسی انداز میں ذکر کیا گیا ہے جیسے بقیہ جلدوں میں ہے۔ اسی جلد میں مصنف نے دس جلدوں کا اشاریہ بھی لگایا ہے: ۱۔ مرد مصنفوں کا اشاریہ، ۲۔ خاتون مصنفوں کا اشاریہ۔ ۳۔ مستشرقین اور غیر ملکی

مصنّفین کا اشاریہ ۴۔فہرست مآخذ۔دھیان رہے کہ کتاب کے اندر مصنف نے شعرا کے تخلص یا خاندانی نسبت کو اول رکھا ہے لیکن ناموں کے اشاریے میں ان کے اصل نام کو مقدم رکھا ہے تا کہ ایک شخص کی تلاش دونوں طرح سے ہو سکے۔جیسے کتاب میں ''عرشی ، امتیاز علی'' اندراج ہوا ہے لیکن اشاریے میں ''امتیاز علی عرشی'' درج ہوا ہے۔اشاریوں سے کتاب کی افادیت دو چند ہو گئی ہے۔

پاکستان کی قومی زبان اردو کے علاوہ چار بڑی علاقائی زبانیں پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو ہیں۔اس کے علاوہ عربی اور فارسی یہاں کی علمی زبانیں رہی ہیں۔میرے محدود علم میں پاکستان کی کسی رائج یا قدیم علمی زبان کے مصنّفین اور شعرا کی اس نہج کی کوئی فرہنگ مرتب نہیں ہوئی ہے جیسی ڈاکٹر رفیقی نے پشتو زبان کے حوالے سے تیار کی ہے۔انھوں نے یہ کام تنِ تنہا، گوشہ نشینی میں رہ کر اپنے ذاتی وسائل بروے کار لا کر انجام دیا ہے۔جس پر ان کی جس قدر تحسین کی جائے کم ہے۔

مقالات علامہ عبدالعزیز میمن: راقم الحروف نے جب اپنے لیے فارسی زبان وادب کا راستہ چنا تو رفتہ رفتہ عربی ادب سے بھی واسطہ پڑا۔جب میں نے اس راستے پر قدم رکھا تو فارسی کے حوالے سے اپنے دور سے پہلے دو محققوں کا شہرہ سُنا اور ان کی تحقیقات بھی نظر سے گذریں۔ایک حافظ محمود خان شیرانی (۱۸۸۰۔۱۹۴۶) اور دوسرے پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع (۱۸۸۳۔۱۹۶۳ء)۔لیکن ان کی زیارت نصیب نہ ہوئی۔حافظ صاحب تو میرے ولادت سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے اور مولوی صاحب کی وفات کے وقت میری عمر آٹھ سال تھی اور مجھے علمی شعور نہ تھا۔اسی طرح عربی زبان وادب کے میدان میں دو ناموں کی گونج کانوں میں پڑی۔ایک علامہ عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸۔۱۹۷۸ء) اور دوسرے ڈاکٹر پیر محمد حسن (۱۹۰۴۔۱۹۹۹) علامہ میمن کی زیارت بھی نہ ہو سکی کہ وہ کراچی میں رہتے تھے،لیکن خوش قسمتی سے پیر محمد حسن مرحوم کی زیارت اور ان کی مختصر صحبت کا شرف حاصل ہوا کیونکہ ہم ایک ہی شہر راولپنڈی میں سکونت گزین تھے۔یہ چاروں حضرات اپنے اپنے میدان کے شہسوار ہیں اور جہاں جہاں فارسی اور عربی ادب میں تحقیق و تدقیق کا چرچا ہوگا برّصغیر پاک وہند کے ان محققین کا نام احترام و تعظیم سے لیا جاتا رہے گا۔

عربی زبان سے ناواقفیت کے سبب مجھے ادب کا براہ راست مطالعہ میسر نہیں آیا اور میں عربی زبان میں علامہ میمن اور پیر صاحب کی تحقیقات سے بے بہرہ ہوں،لیکن انھوں نے تدوین متون

اور تصحیح مخطوطات پر جو کام کیا ہے اس سے دل چسپی ضرور رہی ہے صرف یہ جاننے کے لیے کہ ان کا اصول تحقیق کیا ہے۔

حال ہی میں علامہ میمن کے عربی ادب پر اردو مقالات کا مجموعہ چھپ کر منظر عام پر آیا ہے۔ یہ مقالات پہلے مختلف جرائد میں چھپ چکے ہیں اب یکجا ہوئے ہیں:

مقالات علامہ عبدالعزیز میمن، ترتیب و تدوین: محمد راشد شیخ، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۹ء، ۳۷۴ صفحات۔

یہ علامہ کے ۱۸ مقالات ہیں۔ کچھ حلّاج، ابنِ رشیق، ابوالعلا معری، ابوتمام، ابن الجوزی کے بارے میں ہیں۔ کچھ کتابوں پر نقد و نظر ہے اور کچھ تقاریظ ہیں۔ اس مجموعے کا اہم ترین مقالہ ان دو زبانی خطبات کی تحریری شکل ہے جو انھوں نے عربی لغت نگاری پر ۱۹۶۸ء میں ترقی اردو بورڈ، کراچی کے دفتر میں ارشاد فرمائے تھے۔ میں جب یہ خطبات بالاستیعاب پڑھ چکا تو بے ساختہ زبان سے نکلا ہمارے زمانے میں اگر کوئی شخص علامہ کہلانے کا حق دار ہے تو وہ عبدالعزیز میمن ہیں اور بجا طور پر کتاب کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ علامہ لکھا گیا ہے۔ علامہ میمن کے ان خطبات میں علم و دانش کا فوارہ پھوٹ رہا ہے۔ خواہ یہ خطبات زبانی یعنی حافظے کی بنیاد پر ارشاد ہوئے یا لکھ کر، دونوں صورتوں میں علامہ میمن کا عربی لغت نگاری اور عربی ادب پر تبحر اور احاطہ، کم از کم میرے وصف و ستائش سے باہر ہے۔ ان خطبات میں علامہ میمن تُرکوں کے رطب اللسان ہیں اور ان پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتے ہیں، اس لیے کہ تُرکوں نے اسلامی میراث (مخطوطات) کی بہ نحو احسن حفاظت کی ہے اور عربی، فارسی علمی میراث کے بہترین نسخے ترکی کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ترکوں پر درود و سلام بھیجنے میں راقم السطور ان کا ہم نوا ہے کیونکہ مجھے بھی اپنے کئی علمی کاموں میں بہترین مخطوطات ترکی کے کتب خانوں سے فراہم ہوئے ہیں۔

کتاب کے مرتب محمد راشد شیخ صاحب نے تدوین میں بہت محنت کی ہے۔ اس کے باوجود اکا دکا کتابت کی اغلاط موجود ہیں:

ص ۳۷۵: صہابی/صحابی

ص ۳۸۳: صلاح الدین منجدان/صلاح الدین منجد

ص ۴۲۶: بیٹاں/ بیٹیاں

علامہ میمن نے اپنے خطبات میں فارسی ادب کی معروف کتاب مقامات حمیدی کو حمیدالدین ناگوری کی تصنیف بتایا ہے (ص ۴۴۰)۔ جہاں تک احقر کا علم ہے یہ قاضی حمیدالدین عمر بن محمود بلخی کی ۵۵۱ ہجری میں تصنیف ہے۔

رسائل شیخ علاء الدولہ سمنانی: ابوالمکارم احمد بن محمد بن احمد بیابانکی معروف بہ شیخ علاء الدولہ سمنانی (۶۵۹-۷۳۶ھ) اپنے عہد کے تاثیر گذار ایرانی عارف اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ ان کے افکار اور کتابوں کے اثرات برصغیر تک بھی پہنچے ہیں۔ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (وفات: ۱۰۳۴ھ) کے خطوط میں ان کے افکار کی بازگشت ملتی ہے (دیکھیے: مکتوبات امام ربانی، دفتر یکم، مکاتیب ۱، ۱۱، ۱۸، ۱۲۶، ۲۲۹، ۲۹۱، دفتر دوم، مکاتیب ۲، ۴۲)۔ شیخ علاء الدولہ کا مزار ایران کے شہر سمنان سے پندرہ بیس کلومیٹر دور صوفی آباد کے ویرانے میں واقع ہے۔ راقم السطور وہاں تین بار حاضر ہو چکا ہے۔ پہلی بار فروری ۱۹۸۵ء، دوسری بار مارچ ۱۹۹۳ء اور تیسری بار مارچ ۱۹۹۵ء میں ان کے مزار کی زیارت کے لیے گیا۔ ایک سنسان جگہ پر اپنے وقت کے عظیم عارف اور مصنف کی یک وتنہا قبر دیکھ کر عجیب احساس ہوا۔ اس پر طرفہ یہ کہ سمنان میں میرے ایرانی میزبان مجھے حیرت سے پوچھتے تھے کہ میں شیخ کی قبر کی زیارت کے لیے اتنی دور سے کیوں آیا ہوں؟ کیونکہ ان کے بقول کوئی مقامی ایرانی ان کی قبر کی زیارت کا اہتمام نہیں کرتا۔

شیخ سمنانی سے مجھے اُنس کچھ اس لیے بھی ہے کہ میرے افغانستانی دوست (مقیم ایران) نجیب مایل ہروی نے تقریباً چالیس سال پہلے شیخ کی تصانیف اور حالات زندگی پر کام کرنا شروع کیا تو مجھ سے بھی رابطہ ہوا۔ اس دوران ان سے طویل مراسلت چلی، روبرو ملاقاتیں ہوئیں اور مواد کا تبادلہ بھی ہوتا رہا۔ میں نے اپنے ذاتی کتب خانے سے چہل مجلس (ملفوظات سمنانی) کے مخطوطہ کا عکس انھیں پیش کیا۔ انھوں نے ۱۹۸۶ء میں میرے (باشتراک ڈاکٹر اختر راہی) رسالے کتاب شناسی کے لیے اپنا مضمون "کتاب شناسی ونسخہ شناسی علاء الدولہ سمنانی" بھی دیا جو اس کے اوّلین شمارے کی زینت بنا۔ (صفحات ۱۵۶-۱۹۸) مایل ہروی صاحب نے شیخ سمنانی کی عربی اور فارسی تصانیف پر جم کر کام کیا اور انھیں عالمانہ طریقے سے مرتب کر کے ایران سے شائع کیا۔ انھوں نے شیخ کے حالات پر الگ

سے کتاب ''پیر بیابانکی'' تصنیف کی تھی، جس کی اشاعت کی نوید تو وہ سناتے رہے لیکن یہ تا حال شائع نہیں ہوئی۔

اب پاکستان سے ہمارے کرم فرما سید اویس علی سہروردی (ولادت: یکم اکتوبر ۱۹۵۳ء لاہور) نے شیخ سمنانی کے رسائل کا اردو ترجمہ کروا کر اشائع کیا ہے:

مجموعہ رسائل علاء الدولہ سمنانی (جلد اوّل)، اردو ترجمہ مولانا غلام حسن حسنو، نظر ثانی، مقدمہ، تدوین و اہتمام سید اویس علی سہروردی، اورینٹل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ۳۶۴ صفحات۔

اس جلد میں شیخ کے ۱۲ رسائل شامل ہیں: آداب السفرہ، تذکرۂ مشائخ متقدمین، اسامی مشائخ، تذکرۃ المشائخ، فرحۃ العاملین و فرحۃ الکاملین، سلوۃ العاشقین و سکنۃ المشتاقین، نوریہ، شرح حدیث ارواح المومنین، مکاتیب سمنانی، اوراد واذکار سمنانی، ختام المسک، زین المعتقد۔

سہروردی صاحب نے مقدمہ، حواشی، تعلیقات، تصاویر و نقشہ جات کا اہتمام کر کے اس مجموعے کو علمی انداز میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے جس پر وہ تحسین کے مستحق ہیں۔ ان رسائل کی اشاعت سے کم از کم ان حضرات کو ضرور فائدہ ہوگا جو براہ راست فارسی زبان یا شیخ سمنانی کی تصانیف تک دسترس نہیں رکھتے ہیں۔

سہروردی صاحب کی نظر ثانی اور نگرانی کے باوجود، اس مجموعے میں کئی طرح کے اشکالات راہ پا گئے ہیں۔ جن کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے:

الف: چونکہ فارسی اشعار کا متن اردو ترجمے کے ساتھ موجود ہے، باہمی تقابل سے معلوم ہوا کہ اکثر مقامات پر مترجم فارسی مفہوم کو درست طور پر اردو میں منتقل نہیں کر سکے یا انھوں نے شعر ہی غلط نقل کیا ہے اور اسی غلط سلط شعر کا ترجمہ کر دیا ہے۔ چند مثالیں حاضر ہیں: (ص ۱۰۷)

''نظارگیان روی خویش چون در نگرند از کرانہا
در آئینہ روی دوست بینند زینجاست تفاوت نشانہا''

''یعنی دیکھنے والے اپنے چہروں کو جب دیکھتے ہیں تو چہرے کے کونے کتروں میں بھی دیکھتے ہیں
تا کہ آئینے میں محبوب کا چہرہ دیکھ سکے یہیں سے نشانات کا فرق واضح ہوتا ہے۔''

نجیب مایل ہروی نے ''روی خوبش'' لکھا ہے جسے مترجم نے ''روی خویش'' پڑھا اور لکھا

ہے، باقی ترجمے کا حال معلوم ہے۔

ص۲۰۱: من آن نیَم کہ تو دیدی، تو آنی و بہ از آنی ....یعنی میں وہ نہ رہا جسے تم نے دیکھا تھا اور تو بھی وہ نہ رہا جسے میں نے دیکھا تھا...........''

(مجوزہ ترجمہ: میں وہ نہ رہا جسے تم نے دیکھا تھا لیکن تم وہی ہو بلکہ اس سے بھی بہتر ہو۔)

ص۲۰۲:

''گنج را ہر کسی بہ چنگ آرد مردی اندر نگاہ داشتن است''

''یہ خزانہ اس کے ہاتھ آتا ہے جو اس کی ٹوہ میں رہتا اور کسی صاحب دل کے دامن سے وابستگی رکھتا ہے۔''

(مجوزہ ترجمہ: خزانہ تو ہر کوئی پالیتا ہے، مردانگی اسے سنبھال کر رکھنا ہے۔)

ص۲۰۳: ''بہ ترک جملہ بگفتم ولی تو می یابی۔ یعنی میں نے سب کچھ ترک دیا تا کہ تجھے پاسکوں۔''

نجیب مایل ہروی نے یہ مصرع اس طرح نقل کیا ہے: ''بہ ترَک جملہ بگفتم، ولی تو می بایی'' (مصنفات فارسی، ص۳۳۵) یعنی میں نے سب کچھ ترک کردیا لیکن تمہاری ضرورت پھر بھی ہے۔)

ص۲۰۶: ''مقصود منم ز کعبہ و بت خانہ............ یعنی کعبہ اور بت خانہ دونوں میرا مطلوب و مقصود ہے...........''

(مجوزہ ترجمہ: کعبہ و بت خانہ سے مقصود میں ہوں...........)

ص۲۰۷: ''چون نیست کسی کہ وی این بتوان گفت۔ کیا کروں کوئی نہیں جو اسے بیان کرسکے۔''

شعر غلط نقل ہوا ہے۔ درست مصرع یوں ہے: چون نیست کسی کہ باوی این بتوان گفت (یعنی کوئی نہیں ہے جس سے یہ بیان ہوسکے۔)

ص۲۱۱: ''گل گفتہ بود ہر چہ ز بلبل شنوی۔ یعنی پھول صرف وہی بول اور کہہ سکے گا جسے اس نے بلبل سے سنا ہے۔''

بظاہر اس کا ترجمہ یوں ہے: بلبل سے جو کچھ سنو گے اچھی بات ہی ہوگی۔ فارسی میں ''گل گفتن'' کا مطلب اچھی بات کرنا ہے۔

ص۲۱۷:

”زہر بدیم کہ دانند ہزار چندانم مرا ندانند زین گونہ کس کہ من دانم
بہ آشکار بدم، در نہان ز بد بترم خدای داند و من، آشکار و پنہانم“

”یعنی وہ مجھ سے متعلق جو بھی جانتے ہیں میں اس سے ہزار گنا زیادہ ہوں لیکن وہ مجھے اتنا جانتے ہیں جتنا میں خود کو جانتا ہوں۔ میری جو ظاہر ہے میں باطن میں اس سے بڑھ کر برا ہوں۔ خدا ہی میرے ظاہر اور باطن کو بہتر جانتا ہے۔“

(مجوزہ ترجمہ: لوگ مجھے جتنا برا جانتے ہیں میں اس سے ہزار گنا بُرا ہوں۔ لوگ مجھے اس طرح نہیں جانتے جس طرح میں اپنے آپ کو جانتا ہوں۔ میں کھلے عام برا ہوں اور چھپ کر بد سے بدتر ہوں۔ خدا جانتا ہے اور میں اپنا ظاہر اور باطن جانتا ہوں۔)

ص۲۱۸:

”کعبہ را جامہ کردن ہوس است یای بیتی جمال کعبہ بس است“

”کعبہ کو غلاف پہنا کر اس کا دیدار کرنا فضول ہے، جمال کعبہ کے لیے بیتی کا یائے نسبتی ہی کافی ہے۔“

اس سے زیادہ مہمل نویسی اور بے معنی ترجمے کی مثال اور کیا ہوسکتی ہے؟ شعر ہی غلط نقل ہوا ہے تو ترجمہ کیسے درست ہوتا؟ نجیب مایل ہروی نے یہ شعر یوں نقل کیا ہے:

کعبہ را جامہ کردن از ہوس است تا بہینی جمال کعبہ بس است

(مصنفات فارسی، ۳۵۱)

ص۲۶۰: ایک رباعی کو فرد کی صورت دی گئی ہے یعنی چار مصرعوں کو دو مصرعوں میں لکھا گیا ہے۔ مصرع ثالث ”تا ہیچو کلنگ، ذکر بر دل نزنی“ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ”جب تک مرغِ ذکر دل پر نہ دے مارے“۔ کلنگ پھاوڑے/کدال کو کہتے ہیں، مرغ کو دل پر مارنا کیا ہوا؟

ص۲۶۳: ایک صوفی کے فارسی قول ”قفای نقد بہ از حلوای نسیہ“ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ”ادھار حلوے سے پس پشت پھینکا ہوا زرِ نقد بہتر ہے“۔ معلوم نہیں مترجم نے ”قفای نقد“ کا ترجمہ پس پشت پھینکا ہوا زرِ نقد کیوں کیا ہے؟۔ قفا، گردن کے پچھلے حصے کے علاوہ، تھپڑ کو بھی کہتے ہیں، یہاں وہی مراد ہے۔ یہی محاورہ ایران میں یوں رائج ہے ”سیلی نقد بہ از حلوای نسیہ“۔ اردو محاورہ ”نو نقد، نہ تیرہ

ادھار‘‘اس فارسی قول کا مترادف ہوسکتا ہے۔

ان سب اشعار کے ترجمہ کی مثالیں ہیں، خدا معلوم نثر سے ترجمہ کیسا کیا ہوگا؟

ب: سلوۃ العاشقین وسکتۃ المشتاقین کے مترجم کا نام ص ۱۲۷ پر علی محمد ہادی شگری لکھا ہے لیکن ص ۱۳۰ کی تحریر سے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ مولانا غلام حسن حسنو کا ہے۔سلوۃ کا اردو ترجمہ بقلم علی محمد ہادی، ۲۰۱۲ء میں سہروردی صاحب کا ادارہ شائع کر چکا ہے۔راقم السطور نے دونوں تراجم کو ابتدا سے ملا کر دیکھا تو ایک دوسرے سے مختلف پایا۔جس سے یہی بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ یہ مولانا حسنو کا ترجمہ ہے لیکن غلطی سے سرورق پر علی محمد ہادی کا نام چھپ گیا ہے۔

ج: ویسے تو ہر رسالے کے ابتدا میں مترجم کی طرف سے متعلقہ رسالے کی مختلف اشاعتوں یا قلمی نسخوں کا بتایا گیا ہے لیکن وضاحت سے یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ ان رسائل کے ترجمے کا ماٰخذ کون سی اشاعت یا مخطوطہ تھا؟ قیاس ہے کہ مایل ہروی کی اشاعت سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن اس کا برملا اظہار نہیں ہے۔

د: سہروردی صاحب کے مقدمے میں شیخ سمنانی کی تصانیف کی کتابیات مرتب کرنے والے تین محققین کا ذکر ہوا ہے (ص ۴۰)، ان میں نجیب مایل ہروی کا نام نہیں ہے۔کتابیات پر ان کے مقالے کا اوپر ذکر ہو چکا ہے جو بعد میں ان کی مرتّبہ کتاب چہل مجلس (تہران، ۱۹۸۷ء) کے مقدمے میں بھی شامل ہوا اور مرتب نے مصنفات فارسی علاء الدولہ سمنانی (تہران، ۱۹۹۰ء) پر اپنے مقدمے (ص ۲۱) میں اس کا حوالہ دیا۔سہروردی صاحب نے شیخ سمنانی کے حالات زندگی پر کام کرنے والوں اور ان کے رسائل شائع کرنے والے جن لوگوں کا نام لیا ہے (ص ۴۶-۴۷) وہاں بھی نجیب مایل ہروی کا نام غائب ہے۔

اوراد واذکار سمنانی کے تعارف میں بتایا گیا ہے کہ مترجم کو اس کا ایک ایسا نسخہ دستیاب ہوا ہے جو بخط مصنف ہے (ص ۲۲۱)۔نہ تو اس نسخے کی مزید تفصیل دی گئی ہے اور نہ ہی ’’دستیاب‘‘ ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مترجم کے ذاتی کتب خانے میں ہے یا کہیں اور سے دستیاب ہوا ہے؟

ہ: کتاب میں پروف خوانی پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی اور پہلے ہی صفحے (’’حرف چند‘‘، ص ۹) سے اغلاط شروع ہو جاتی ہیں۔ابوالمکارم کو ابوالمقارم، چنانچہ کو چنانچے (یہ غلطی کتاب میں بتکرار و

بکثرت موجود ہے) لکھا ہے۔ شیخ احمد سرہندی کا سال وفات ۹۷۱ھ لکھا ہے یہ ان کا سال ولادت ہے۔ ایک مہمل جملہ یوں ہے: ''ایک بھرپور مقدمہ جو شیخ کے احوال و مقامات پر مستعمل [کذا] ہے، شامل کردیا ہے۔'' غالباً مشتمل کو مستعمل لکھا ہے۔ جب ''مشتمل'' ہے تو ''شامل کردیا ہے'' حشو ہے۔

ص ۱۲: شیخ سمانی لکھا ہے۔ (درست: شیخ سمنانی)

ص ۲۸: شیخ عبدالقاسم الجورجانی (درست: شیخ ابوالقاسم کرّگانی)

ص ۳۹: ۶۴۷ ہجری شمسی (درست: ہجری قمری)

ص ۴۰: صفادی نے اپنی کتاب الوافی بالوفایت (درست: صفدی نے اپنی کتاب الوافی بالوفیات)

ص ۴۱: العروہ لاهل الخلوۃ والجلو (درست:..........الجلوۃ)

ص ۵۱: تسامع (درست: تسامح)

ص ۷۸: شیخ اسفرئنی (درست: اسفرائنی)

ص ۹۲: موضح (درست: موضع)

ص ۱۹۷: واقع (درست: واقعہ)

ص ۲۲۷، ۲۲۹: مکرر رسالہ کا نام ختام المُشک، ختام مشک لکھا ہے۔ یہ ختام المسک ہونا چاہیے، جیسا کہ ص ۲۳۶ پر ہے۔

ص ۲۵۰: صوفیاے مبتدی (درست: صوفیہ مبتدی)

ص ۲۹۱: جامع التوریخ (درست: جامع التواریخ)

ص ۳۱۴: پیروں (درست: پیروکاروں)

ص ۳۱۶: ذلنورین (درست: ذی النورین)

ص ۳۳۷: مام خمینی (درست: امام خمینی)

ناشر نے اس اشاعت کے چار مختلف نام رکھے ہیں۔ جلد پر ''رسائل الشیخ علاء الدولہ سمنانی فی التصوف'' چھپا ہے؛ اندر پہلے ورق پر ''رسائل سمنانی''، کتاب کے سرورق پر ''مجموعہ (۱۰) علاء الدولہ سمنانی'' اور ضابطۂ کتاب کے صفحے پر ''مجموعۂ رسائل سمنانی'' چھپا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا ایک نام اختیار

کیا جاتا، تاکہ فہرست سازوں اور کتابداروں کو کتاب کی انڈیکسنگ کے وقت الجھن نہ ہوتی۔ مجموعے میں شامل رسائل کی حقیقی تعداد اور سرورق پر لکھی تعداد میں بھی فرق ہے۔ سرورق پر تعداد دس رسائل درج ہے جب کہ مجموعے میں بارہ رسائل ہیں۔ جلد پر دی گئی تفصیل کے مطابق گیارہ اور بارہ شمارہ پر مواردالشوارد اور رسالۂ ختام المسک ہے جب کہ اندرونی فہرست اور مشمولات میں مواردالشوارد کی جگہ زین المعتقد ہے۔

چونکہ ناشر نے اس جلد کو جلد اوّل کے طور پر شائع کیا ہے، امید کی جاتی ہے کہ جلد دوم کی اشاعت میں مزید احتیاط سے کام لیا جائے گا۔

فارسی سے اردو میں ترجمہ ہونے والی اکثر و بیشتر کتب میں طرح طرح کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ مترجمین کا زبان پر عبور نہ رکھنا اور اس کی باریکیوں سے ناواقف ہونا، کسی مستند متن کو بنیاد نہ بنانا، متن کی عبارتوں کو ٹھیک طور پر نہ سمجھنا، سمجھ میں نہ آنی والی عبارتوں کا ترجمہ چھوڑ کر جان چھڑانا .... یہ سب وہ آفات ہیں جو ہم فارسی سے اردو میں ترجمہ شدہ کتب میں روزانہ دیکھتے ہیں اور بقول اقبال: می نگریم و می رویم!

جامعہ نظامیہ بغداد کا علمی و فکری کردار: سلجوقی وزیر، خواجہ نظام الملک طوسی (۴۰۸-۴۸۵ھ) اپنے کئی علمی کارناموں کی بنا پر اسلامی تہذیب اور ادب کی تاریخ کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اس کی فارسی تصنیف سیر الملوک/ سیاست نامہ (تنقیدی ایڈیشن بہ تصحیح محمود عابدی، تہران، نشر سخن و فرہنگستان زبان وادب فارسی، ۲۰۱۹ء) اصول کشورداری پر ایک عمدہ دستور العمل ہے۔ لیکن وہ اپنے ایک اور کارنامے کے باعث زیادہ یاد رکھا جاتا ہے۔ یہ کارنامہ، اس کے ہاتھوں مدارس کے قیام کا ایک سلسلہ ہے جو بغداد سے شروع ہو کر ارض اسلامیہ کے کئی شہروں تک پھیلا اور اسی کے نام سے منسوب ہو کر "نظامیہ" کہلایا۔ عجیب اتفاق ہے کہ برّصغیر پاک و ہند میں بھی "درس نظامیہ" رائج ہے لیکن اس کا نظام الملک سے نہیں، ملّا نظام الدین سہالوی (۱۰۸۸-۱۱۶۱ھ) سے تعلق ہے۔ خیر، یہ جملۂ معترضہ تھا۔

بغداد کا نظامیہ ۴۵۷ تا ۴۵۹ھ تاسیس ہوا۔ نظام الملک طوسی نے عالم اسلام سے چن چن کر علماء کو لا کر وہاں تدریس پر مامور کیا۔ امام محمد غزالی اور ان کے بھائی احمد غزالی بھی ان میں شامل ہیں۔ نظامیہ بغداد (اور دیگر نظامیہ) نے اسلامی علوم اور افکار کی تبلیغ و توسیع میں بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

عربی اور فارسی زبانوں میں تو نظام الملک کے تاسیس کردہ نظامیہ مدارس کی خدمات پر کتب ملتی ہیں لیکن اردو کا دامن اس سے اب تک تہی چلا آرہا تھا۔ یہ کمی ڈاکٹر حافظ محمد سہیل شفیق، استاد شعبہ تاریخ اسلامی، جامعہ کراچی نے پوری کر دی ہے اور نظامیہ بغداد کی دو سو سالہ تاریخ اور خدمات کا جائزہ لیا ہے:

جامعہ نظامیہ بغداد کا علمی و فکری کردار (۴۵۷ھ/۱۰۶۵-۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء)، محمد سہیل شفیق، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء، ۳۸۸ صفحات۔

یہ کتاب بنیادی طور پر مصنف کا پی ایچ ڈی مقالہ ہے جسے اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ سات ابواب پر مشتمل ہے۔ کچھ ابواب کی تفصیل یہ ہے: تیسرا باب: مدرسۂ نظامیہ بغداد، چوتھا باب: مدرسین نظامیہ بغداد، پانچواں باب: طلبہ نظامیہ بغداد، ساتواں باب: نظامیہ بغداد کا علمی و فکری کردار۔ کتاب اعلام، اماکن اور کتب کے اسما کے اشاریوں کے ساتھ ہے۔

مصنف نے ''طالب'' کے صیغۂ جمع کو اکثر مقامات پر ''طلبا'' لکھا ہے (ص ۱۹۵، ۱۹۷، ۱۹۸ وغیرہ)۔ درست املا ''طلبہ'' ہے۔ ویسے بطور صیغۂ جمع ''طُلّاب'' بھی استعمال ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر مصنف نے اس کتاب کی تیاری میں بہت محنت کی ہے اور کوئی بات بلا حوالہ نہیں لکھی۔ ہماری جامعات میں اس نوعیت کے معیاری کام ہونے لگیں تو کیا بات ہے۔

تذکرہ علماء اہل سنت ضلع اٹک: اٹک، پاکستان میں صوبۂ پنجاب کا شمالی سرحد پر آخری مقام ہے۔ اس سے آگے دریائے سندھ کے اس پار صوبہ پختون خوا (سابق صوبہ سرحد) ہے۔ اٹک کا نام، انگریزی دور میں کیمبل پور تھا۔ سوق الجیشی نقطۂ نظر سے اٹک بہت اہمیت رکھتا ہے اور قدیم دور سے تاریخی کتابوں میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس شہر میں علمی روایت بھی دیرینہ ہے اور اب تک جاری و ساری ہے۔ زیادہ پرانی بات نہیں کہ اٹک میں غلام جیلانی برق (۱۹۰۱-۱۹۸۵ء) اور نذر صابری (۱۹۳۳-۲۰۱۳ء) جیسے اہل دانش گذرے ہیں۔ اٹک سے متعلق حال ہی میں سید نصرت بخاری کی کتاب شخصیات اٹک دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، جس میں ہر طبقۂ زندگی کے لوگوں کو شامل کیا گیا ہے۔ اب ضلع اٹک میں بسنے والے علمائے اہلسنّت و جماعت کا تذکرہ مرتب ہوا ہے:

تذکرہ علماء اہلسنت ضلع اٹک، تصنیف حافظ محمد اسلم رضوی، اسلامک میڈیا سنٹر، لاہور، ۲۰۱۹ء، ۶۰۴ صفحات۔

اس میں قدیم وجدید ۱۸۰ لوگوں کا ذکر ہوا ہے۔اس میں ایسے لوگوں کا بھی تذکرہ ہے جو کسی زمانے میں ضلع اٹک کی حدود میں کچھ عرصے کے لیے اقامت گزین رہے۔جیسے محمد افضل سرخوش مصنف کلمات الشعرا جو ۱۰۸۷ھ میں حسن ابدال مضافات اٹک میں عدالت میں کام کرتے تھے۔(ص ۵۷۸)

دیوان اشک رام پوری: صاحب زادہ واجد علی خان اشک رام پوری عرف اچھن صاحب (۱۸۹۱۔۱۹۵۸ء) خلف محمد علی خان (۱۸۶۲۔۱۹۱۹ء) کا تعلق نوابان رام پور کے خاندان سے ہے۔ وہ نواب یوسف علی خان ناظم کے نواسے اوران کے چھوٹے بھائی صاحب زادہ کاظم علی خان (۱۸۲۰۔۱۸۷۳ء) کے پوتے تھے۔نواب رضا علی خان کے پرسنل سیکرٹری بھی رہے۔کیمبرج یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں ڈگری یافتہ تھے۔لیکن ۱۹۴۶ء میں ان کی زندگی میں ایک ہیجان برپا ہوا اور وہ رام پور چھوڑ کر پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں گولڑہ پہنچ گئے اور یہاں سید عبدالقادر جیلانی کی اولاد سے چشتی سلسلے کے بزرگ سید غلام محی الدین عرف بابو جی (۱۸۹۱۔۱۹۷۴ء) کے مرید ہوکر وہیں رہ گئے۔ گولڑہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔کہاں رام پور، کہاں گولڑہ!

ان کا شاعری کا ذوق بہت پختہ اوراعلیٰ تھا۔ان کا چھوڑا ہوا اردو کلام اب بے حد سلیقے کے ساتھ مرتب ہوا ہے اور نفاست سے شائع ہوا ہے۔:

دیوان اشک،مرتبہ ڈاکٹر محمد شاہ کھگہ ،مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء، ۲۹۴ صفحات۔

رام پور کے اردو گو شعرا پر کام کرنے والے محققین اشک کو نظر انداز نہیں کر پائیں گے۔یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میں جو کہتا ہوں محبت کا کچھ انجام نہیں — بات دنیا کی ہے،تم پر کوئی الزام نہیں
ہاتھ رکھ کر جو وہ پوچھیں دل بیتاب کا حال — ہو بھی آرام تو کہہ دوں مجھے آرام نہیں
سن کے افسانۂ غم مجھ سے کبھی دیکھو تو — نہ رلا دوں تمھیں تو اشک مرا نام نہیں

(ص ۱۲۶۔۱۲۷)

چندر بھان برہمن کی دو تصانیف کی اشاعت: چندر بھان برہمن لاہوری شاہجہان اور داراشکوہ کے دارالانشا کا میر منشی اور فرمان نویس تھا۔وہ انشا نگاری،خوشنویسی اوراعلیٰ شعری ذوق کی بنا پر نہ صرف شاہ جہان، بلکہ اس کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان اور دیگر شاہزادوں اور امرا کا بھی پسندیدہ

تھا۔ برہمن کی اسی اہمیت کے پیش نظر اس پر اب تک کم از کم تین مستقل کتب لکھی جا چکی ہیں جن کے مصنّفین محمد عبدالحمید فاروقی (۱۹۶۷ء)، جگدیش نرائن کلشر شتا (۱۹۷۶ء) اور راجیو کنرا (۲۰۱۵ء) ہیں۔ تینوں کتب انگریزی میں ہیں۔ برہمن کا فارسی دیوان، تین بار، اور دیگر تصانیف سے منشآت برہمن اور چہار چمن شائع ہو چکی ہیں۔ حسن اتفاق ہے کہ ۲۰۲۰ء کے آغاز میں برہمن کی دو تصانیف تقریباً ایک ساتھ دو الگ الگ ملکوں سے شائع ہوئی ہیں۔ پہلی گلدستہ، دہلی سے اور دوسری تحفۃ الفصحا تہران سے۔

گلدستہ، تصحیح وحواشی پروفیسر راجندر کمار، گریٹ بک کنٹریکٹر، دہلی، جنوری ۲۰۲۰ء، ۱۱۲ صفحات۔

برہمن کے حالات اور فہرست تصانیف میں گلدستہ کا نام نہیں ملتا۔ جس کتاب کو گلدستہ نام سے پروفیسر راجندر کمار نے مرتّب اور شائع کیا ہے یہ دراصل برہمن کی کتاب چہار چمن کا ''چمن دوم'' ہے اور الگ سے کوئی تصنیف نہیں ہے۔ خود مصنف نے پیش نظر اشاعت کے صفحہ ۱۸ پر کتاب کا نام چہار چمن برہمن وضاحت کے ساتھ لکھا ہے: ''این گلشن ہمیشہ بہار معانی را بالہام فیض چہار چمن برہمن [راجندر کمار: برمن] موسوم می سازد''، لیکن پروفیسر راجندر کمار نے اس طرف توجہ نہیں دی اور اپنے زیر استعمال مخطوطوں کے ترقیمہ کی بنیاد پر، جس میں کاتبوں نے کتاب کا نام گلدستہ لکھا ہے، اسے گلدستہ سے موسوم کیا ہے۔

چہار چمن کا مکمل متن سید محمد یونس جعفری، استاد شعبۂ فارسی دہلی کالج (ذاکر حسین کالج) نے مرتب کر کے ۲۰۰۷ء میں دہلی سے شائع کر دیا تھا اور صحت متن کا اہتمام کیا تھا۔ پروفیسر راجندکمار کے مرتبہ گلدستہ کا متن، پروفیسر جعفری کے مرتبہ چہار چمن کے صفحات ۸۵ تا ۱۲۳ کے مطابق ہے۔

پہلے تو اس کتاب کو گلدستہ نام دے کر چھاپنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، کیونکہ چہار چمن میں یہ باب شامل ہے اور چہار چمن چھپ چکی ہے۔ اگر گلدستہ چھاپنا ناگزیر تھا تو متن کی صحت کا لحاظ رکھا جاتا۔ افسوس کہ گلدستہ کے مرتّب مخطوطہ ٹھیک طور پر نہیں پڑھ سکے اور جا بجا غلطیاں کی ہیں جس کی ابتدا پہلی سطر سے ہو جاتی ہے۔ ادای شکر کو رودی شکر، علو مدارج کو غلو بدایع اور خاصان یا حاجبان کو حاجیان پڑھا ہے۔ متن کی غلط قرأت کا یہ سلسلہ دراز ہے اور آخر تک چلا جاتا ہے اور عجیب گل افشانیاں کی ہیں۔ عنبر افشانی کو غیر افشانی اور نغمہ سرائی عندلیب کو لقمہ برای عندلیب بنا دیا ہے۔ شعروں کو نثر پڑھا گیا ہے۔ یہ نمونہ ملاحظہ ہو، نقل مطابق اصل ہے: سنا تشرع آبدار و آتش افروز در آب تیغ او کلو سوز

بہ ہرسوی کہ راند مرکب خان بہ استقبالش آید فتح رقاص۔(ص ۹۷)۔حالانکہ یہ مثنوی صنف میں دو شعر ہیں:

سنانش آبدار و آتش افروز (ز سردی؟) آب تیغ او گلو سوز

بہ ہرسوی کہ راند مرکبِ خاص بہ استقبالش آید فتح رقّاص

میں یہاں غلطیوں کی تفصیل اور مزید مثالوں میں نہیں جاؤں گا۔گلدستہ کے مرتب اگر چاہیں تو اپنے پیشرو ڈاکٹر یونس جعفری کے مرتبہ متن سے اپنا متن ملا کر جانچ کر سکتے ہیں۔

تحفۃ الفصحا،تصنیف چندر بھان برہمن لاہوری،مقدمہ،تصحیح تعلیقات عارف نوشاہی،تہران، انتشارات سفیر اردہال،۱۳۹۸شمسی،۱۵۲ صفحات۔

یہ اکبر،جہانگیر اور شاہ جہان دور کے چیدہ چیدہ ایرانی،تورانی اور ہندوستانی شعرا کا مختصر تذکرہ ہے،جس میں زیادہ تر شعرا مصنف کے معاصر ہیں۔بعض کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔راقم السطور کو اس تذکرے کا ایک ہی قلمی نسخہ نیشنل آرکائیوز آف پاکستان،اسلام آباد سے ملا تھا جس کی بنیاد پر اسے تدوین کیا گیا ہے۔متن کے ساتھ،مصنف کے حالات اور تحفۃ الفصحا کی اہمیت پر مشتمل مقدمہ،شعرا کے مزید حالات پر مشتمل تعلیقات اور ۹/اشاریے لگائے گئے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

قرآن کی روشنی میں (ہم معنی آیات کے مطالب پر مبنی مجموعہ مضامین) از جناب محمد ثناء اللہ عمری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۴۸۲، قیمت درج نہیں، پتہ: مصنف، ڈور (Door) نمبر ۲۱/ ۵۵۳، فرنچ پٹ، مچھلی پٹنم۔ ۵۲۱۰۰۲

نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہے اور یہ پورا عرصہ قلم و قرطاس کے رشتہ کی مضبوط اور خوبصورت تصویر پیش کرتا نظر آتا ہے۔ مصنف کی وطنی نسبت ارض دکن سے ہے لیکن قلم کی حسبی شان کچھ اور کہتی ہے۔ مولانا دریابادی کے اسلوب کے تتبع کو دوسروں کے لیے ناممکن سمجھا گیا لیکن عمری صاحب نے مچھلی پٹنم اور دریاباد کے فاصلوں کو جس خوبی سے قربتوں میں بدلا وہ صرف داد طلب ہے۔ شخصیات و ادبیات کے ساتھ قرآنی خدمت میں گویا اسی سلسلۂ ماجدیہ کی برکت ہے، ہم معنی آیات کو ایک لڑی میں پرو کر ہم موضوع بنانا اور پھر ان کے اصل منتہی و مدعا کو واضح کرنا گو بالکل منفرد کام نہ ہو لیکن اس کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کتاب دو حصوں میں ہے پہلے میں انبیاء علیہم السلام، کتب سماویہ، ملت ابراہیمؑ، عبادات، فضائل و رذائل، آخرت وغیرہ موضوعات کے تحت مضامین ہیں، مثلاً حضرات انبیاء کرامؑ کے باب میں دہشت گردی اور شکاری خود شکار ہو گئے جیسے عنوانات ملتے ہیں، رذائل میں گوسالہ پرستی، سبت ایک کھلواڑ جیسے عنوان ہیں، دوسرا حصہ بھی انہی موضوعات پر ہے یعنی گویا یہ حصہ اول کا تتمہ ہے۔ حضرات اسمٰعیل و یوسف و موسیٰ اور مریم و عیسیٰ علیہم السلام کی زندگی کے ایک حصہ کو اطفال القرآن کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صاحب اقبال بچپن ہی سے پہچان لیا جاتا ہے، قرآن کی تفصیلات اسی نوعیت کی ہیں۔ یہ سب کے لیے سرمۂ بصیرت ہیں، بچوں ہی کے لیے نہیں بڑوں کے لیے بھی، رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ایک موضوع ہے اور اس کے تحت رحم و کرم، مساوات، احترام انسانیت، عدل و انصاف، خلافت، طبقہ نسواں کی حمایت، غلاموں کی مسیحائی جیسے ذیلی عناوین سے تمام آیات کی خوشبو کشید کر لی گئی۔ پوری کتاب کا یہی عالم ہے، زبان آسان، ترجمانی آسان تر اور تفہیم آسان ترین۔ اتنی آسانیوں کے بعد فائدہ اور افادہ دشوار ہو ہی نہیں سکتا۔ عام مطالعہ کے علاوہ واعظین و مقررین کے لیے یہ خاص طور پر نہایت نافع ہے۔

جدید عربی زبان و بیان کے مشاہیر از پروفیسر محمد راشد ندوی، مرتب ڈاکٹر ابوذر متین، متوسط

تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۲۰، قیمت ۳۰۰/روپے، پتہ: دارالکتاب، دودھ پور، علی گڑھ اور علی گڑھ کے دیگر مشہور مکتبات۔

عبدالرحمن الکواکبی، شیخ عبدہ، شیخ رشید رضا، شکیب ارسلان، کرد علی، عباس محمود عقاد، سید قطب، توفیق الحکم، محمود محمد شاکر، مصطفی زرقاء جیسے مشاہیر سے اردو کا علمی و تعلیمی حلقہ عام طور سے واقف ہے، ان کے ساتھ خلیل مردم بک، احمد لطفی السید، یحییٰ حقی جیسے نامور عربی ادیب و اہل قلم کا ذکر کچھ انداز سے مل جائے تو یہ ایک نعمت سی ہے، اس پر مستزاد مولانا فراہی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جمہرۃ البلاغہ اور فی مسیرۃ الحیاۃ کے مطالعہ میں ان حضرات کے علم وفضل اور شخصیت کی جلوہ ریزی ہو تو پھر نورٌ علی نور، فاضل مصنف عصر حاضر میں عربی تعلیم وتدریس کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے اور کوئی شبہہ نہیں کہ انہوں نے یونیورسٹی کی سطح کے تعلیمی اداروں میں عربی زبان وادب کو وقعت و قیمت بخشی، وہ ان میں سے ہیں جن کو عربی ادب کی ترویج و اشاعت، عظمت و اہمیت اور عربی زبان کی لسانی، ادبی تاریخ اور فکری رفعت کا ادراک ہے اور عربی پڑھانے کی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے، کتاب کے نوجوان اور لائق مرتب نے صحیح لکھا کہ پروفیسر راشد صاحب قدیم وجدید عربی ادب کے رموز وآشنا بلکہ اداشناس ہیں، ان خوبیوں میں یہ اضافہ بھی بے محل نہیں کہ وہ احسان شناس بھی اسی درجہ کے ہیں، عبدالرحمن الکواکبی کا ذکر ہے اور پہلی ہی سطر کچھ کہہ جاتی ہے، سطر یوں ہے کہ ”۱۹۵۲ء میں جب میرے استاد محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی......“ یہاں اس ”میرے“ نے ایک خوش نصیب طالب عالم کی وجہ خوش نصیبی جس طرح ظاہر کی وہ بڑے بڑے الفاظ پر بھاری ہوگئی، کواکبی کی تحریروں میں پڑھنے والے کو ماحول کی گھٹن کا احساس ہوتا ہے، فاضل مصنف لکھتے ہیں کہ اس گھٹن کا احساس صحیح معنوں میں ان ہی لوگوں کو ہوتا ہے جو غیر معمولی حساس ہوتے ہیں اور قوت حس ہی صحیح معنوں میں ذہنی بیداری کی علامت ہے، مصنف کے استقرائی ذہن، مدح وقدح میں لہجہ کی سنجیدگی اور رائے کے توازن نے اشخاص کی اصل تصویر پیش کرنے میں جو کامیابی حاصل کی ہے، کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے، مضامین تو سب اعلیٰ پایہ کے ہیں لیکن ہمارے لیے سب سے دلچسپ ان کا دیباچہ ہے جو دراصل ان کی تعلیمی زندگی کی سیدھی، سچی اور دل لگتی داستان ہے، اس میں ان نوجوانوں کے لیے خاص پیغام ہے جو خواب دیکھتے ہیں لیکن خواب دیکھنے کا سلیقہ نہیں سیکھتے۔ (ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

امثال اللغتین (الاردیہ-العربیہ): تالیف عبدالرحمٰن الکاشغری الندوی، المحقق عبدالہادی الاعظمی الندوی، ایویروزا اکیڈمی، علی گڑھ۔ قیمت درج نہیں۔

اوراق پارینہ: محمد انوارالحق تبسم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ قیمت ۳۰۰/روپے

اہل بیت اور صحابہ کرامؓ کا مقام و مرتبہ: مولانا سید عبدالحی حسنیؒ، ترجمہ و تعلیق محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی، مجلس تحقیقات و نشریات، ندوہ کیمپس، ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ قیمت ۹۰/روپے

بھوپال کا علمی و ادبی کارواں: حکیم سید ظل الرحمٰن، ابن سینا اکاڈمی، علی گڑھ۔ قیمت ۲۷۵/روپے

بھینس کی قربانی-ایک علمی و تحقیقی جائزہ: ابوعبداللہ عنایت اللہ، جمعیت اہل حدیث ٹرسٹ، بھیونڈی قیمت درج نہیں۔

جذبات وجیہ (نعتیہ کلام): مولانا شاہ وجیہ الدین، مرتب مولانا مظاہر اللہ خان وجیہی، دانش محل، امین آباد، لکھنؤ۔ قیمت ۵۰/روپے

خطب أيام الجمعة فی ضوء الكتاب والسنة: مولانا سعید الاعظمی، جمع و ترتیب: محمد فرمان الندوی، مکتبة الشباب العلمية، لکھنؤ۔ قیمت ۱۶۰/روپے

دستاویز (بندی کلاں کا تاریخی پس منظر و شجرۂ نسب): اخلاق احمد بندوی، المعروف ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، بندی کلاں، مئو (اعظم گڑھ) قیمت ۵۰۰/روپے

قد اور سائے: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مکتبہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔ قیمت ۱۸۱/روپے

منظوم تاریخ خاندان: حکیم سید ظل الرحمٰن، ابن سینا اکاڈمی، علی گڑھ۔ قیمت ۱۷۵/روپے

موج خامہ: ضیاء الرحمٰن (ضیا) اعظمی، اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دہلی۔ قیمت ۳۰۰/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ		اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-	سفرنامہ روم و مصر و شام	200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی		کلیات شبلی (اردو)	220/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	کلیات شبلی (فارسی)	45/-
الفاروق	300/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
الغزالی	200/-	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
المامون	175/-	مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	80/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
شعر العجم اول	300/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	90/-
شعر العجم سوم	125/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
شعر العجم پنجم	150/-	خطبات شبلی مرتبہ: عبد السلام ندوی	80/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-	انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی		مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
الکلام	250/-	مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
علم الکلام	200/-	اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
March 2020 Vol - 205 (3)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات